ذکرِ علیگڑھ
پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

ناشر : فاروق اعجاز

طابع : ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اردو ڈائجسٹ پرنٹرز

پبلشرز : مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور

اشاعت : اول

قیمت : ۲۵ روپے

اردو ڈائجسٹ پرنٹرز ۲۴- سرکلر روڈ ، لاہور

ذکرِ علی گڑھ

ابنائے علی گڑھ کی دلکش اور پربہار یادداشتیں

مرتبہ

عبدالمجید قریشی

مکتبہ اردو ڈائجسٹ • سمن آباد • لاہور

انتساب

بابائے علی گڑھ سر سیّد احمد خاں کے نام

پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

اِس کتاب میں

پیش لفظ

اردو زبان میں اہلِ قلم حضرات نے اپنے کالجوں، اسکولوں اور دیگر درس گاہوں کے اپنے اساتذۂ کرام اور ہم عصر طلبا کے متعلق اپنے تاثرات و مشاہدات کو حیطۂ تحریر میں لانے میں اس قدر بخل سے کام لیا ہے کہ ہمارا ادب اس دلچسپ اور پُرلطف موضوع سے قریب قریب تہی داماں نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے مطالعے کی ہمہ گیر وسعت کے باوجود اس عنوان پر غیر علیگ حضرات میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" اور "نذیر احمد کی کہانی"، جناب احمد ندیم قاسمی کے مضمون "ایک ریاستی کالج"، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے "فورمن کرسچن کالج میں چار سال"، مولانا صلاح الدین احمد کے "میرے استاد مرزا اظفر الحسن" کے "پیرانِ جامعہ" اور جناب ضیاء الدین احمد برنی کے مضمون "مولوی محمد اسحٰق" کے علاوہ کچھ اور مضامین سے لطف اندوز نہ ہو سکا، تاہم سید رئیس احمد جعفری نے بعض مضامین میں اپنے چند اساتذہ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حمید حسن خاں، پروفیسر کیلاٹ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا ذکر کیا ہے۔ مزید برآں ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں تعلیم پائی اپنی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" میں ذاکر صاحب کے علاوہ جامعہ کے ممتاز اساتذہ مولانا محمد سورتی، مولانا خواجہ عبدالحی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر ہادی حسن اور شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنی خود نوشت داستان "میری دنیا" میں اپنے پرائمری اور

ہائی اسکولوں کے چند اساتذہ کی یادوں کو زندہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ راقم الحروف نے "عربک کالج دلّی میں ازمطالعہ سال" کے عنوان سے ایک طویل مقالے میں مسلمانانِ دلّی کی اس پُرشکوہ درس گاہ میں بیتے ہوئے دنوں کی روداد قلم بند کی تھی۔

ایسے ماحول میں جب میں ابنائے علی گڑھ کے ان مضامین پر نظر ڈالتا ہوں جو انہوں نے مادرِ درس گاہ کی شان میں کمالِ عقیدت واحترام کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں اور جنہیں میں نے برسوں کی محنت اور کاوش کے بعد اس مجموعے کی شکل میں مدوّن کیا ہے، تو مجھے بڑی ہی مسرت حاصل ہوتی ہے اور میرا دل بے اختیار یہ چاہتا ہے کہ میں اس محفل میں اُن تمام حضرات کو بھی مدعو کر ڈالوں جو علی گڑھ جیسی اہم قومی و علمی تحریک اور اس کے عظیم سربراہ سر سید احمد خاںؒ صاحب کی ذاتِ گرامی سے ذرا بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

ابنائے علی گڑھ کی ان تحریروں کو جمع کرنے کا خیال میرے دماغ میں اب سے کوئی بیس سال پیشتر ۱۹۵۵ء کے اواخر میں آیا جب اس زمانے میں شائع ہونے والے "علی گڑھ میگزین" کے "علی گڑھ نمبر" میں "میر ولایت حسین کی ڈائری" میری نظر سے گزری۔ سید محمد تونکی صاحب کا یہ مضمون علی گڑھ کے دورِ اوّل کے مشہور استاد میر ولایت حسین صاحب کی غیر مطبوعہ آپ بیتی کا ملخص تھا۔ میر ولایت حسین صاحب علی گڑھ کے وہ اُستاد ہیں جن کے شاگردوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید محمود، الحاج خواجہ ناظم الدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور سر سکندر حیات خاں جیسے اکابر کے نام آتے ہیں۔ یہ مضمون بہ یک نظر مجھے بہت ہی پسند آیا اور اسے پڑھ کر میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میر صاحب کی یہ آپ بیتی جلد سے جلد منظرِ عام پر آجائے اور میں اس کا تفصیلی مطالعہ کرسکوں۔ اپنی اس آرزو کو بروئے کار لانے میں خدا جانے کس کس سے کیا کچھ مراسلت ہوئی اور کس کس در پر جبیں سائی کرنی پڑی وہ ایک لمبی داستان ہے۔ وقت بہرطور گزرتا ہی گیا اور الحمدللہ کہ بیس برسوں کے طویل

انتظار کے بعد میر صاحب کی یہ آپ بیتی ایک خوب صورت کتاب کی صورت میں میرے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ میں میر ولایت حسین صاحب کے فرزندِ ارجمند سید مسعود زیدی صاحب کا ذاتی طور پر ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے ۱۹۷۵ء میں اپنے والدِ گرامی کی اس چھوڑی ہوئی نشانی کو "میرے پچاس سال علی گڑھ میں" کے زیرِ عنوان بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرادیا۔ یہ پوری کتاب مجھ علی گڑھ کے دیوانے کے نقطۂ نظر سے اس قدر دلچسپ تھی کہ جب میں نے اسے ختم کیا تو سید محمد تونکی صاحب کی مرتبہ ڈائری میری نظر سے گرگئی کیونکہ اس میں بہت سے اہم امور خصوصاً جسٹس سید محمود کا تذکرہ اور سر سیدؒ کی رحلت کا واقعہ وغیرہ چھوٹ گئے تھے۔ چنانچہ اپنے زیرِ نظر مجموعے میں شمولیت کی غرض سے میں نے خود ہی اس کی تلخیص کی تمام اہم واقعات کو شامل کیا اور یوں اطمینانِ دل حاصل ہوا۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنی باقاعدہ خود نوشت سیرت کوئی نہیں چھوڑی، لیکن اس کمال کی داد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کو دی جانی چاہیئے کہ انہوں نے مولوی صاحب کی تحریروں کو یکجا کر کے ان کی آپ بیتی مرتب کر ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب کا مفصل مضمون اب سے بارہ سال قبل انجمن ترقی اُردو پاکستان کے نقیب "قومی زبان" کراچی کے "بابائے اردو نمبر ۱۹۶۳" میں شائع ہوا تھا اور اب حال ہی میں اسے "ذکرِ عبدالحق" کے نام سے کتابی شکل دے دی گئی ہے۔ بابائے اردو کے علی گڑھ کی داستان اسی کتاب کا ایک باب ہے، البتہ اس کی ترتیب میں خفیف سی تبدیلی کی گئی ہے۔

سر سید رضا علی کی شہرۂ آفاق خود نوشت "اعمال نامہ" اگرچہ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں شائع ہو چکی تھی لیکن مجھے مطالعے کے لئے یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں ملی۔ سید رضا علی اپنے دور کے ایک ممتاز علیگ تھے۔ انہوں نے علی گڑھ اور اپنے دور کے اکابر علی گڑھ پر کھل کر لکھا ہے اور وہ "اعمال نامہ" میں جابجا بکھرا پڑا ہے۔ میں نے اس تمام مواد کو اکٹھا کیا اور ازسرِ نو

مرتب کرکے موجودہ صورت میں ڈھال دیا۔

چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب "شاہراہِ پاکستان" کا ایک طویل باب علی گڑھ کے لئے وقف کیا ہے جس کا اختصار اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے چودھری صاحب کا شمار بھی علی گڑھ کالج کے اہم طلبا میں ہوتا تھا۔

نواب حافظ سر محمد احمد سعید خاں چھتاری، خان بہادر حکیم احمد شجاع ساحر، پروفیسر محمد الیاس برنی اور نواب مشتاق احمد خاں کی خودنوشت سرگزشتوں "یادِ ایام"، "خون بہا"، "صراط الحمید" اور "کاروانِ حیات" میں ان حضرات کا علی گڑھ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور یہ سب کچھ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ میں نے اپنے اس مجموعے میں شامل کر لیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جناب محفوظ الحق حقی کی کتابوں "آشفتہ بیانی میری" اور "علی گڑھ کے چار سال" کا تو موضوع ہی باغ و بہار علی گڑھ ہے لہٰذا وہ بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور کا مضمون ان کی اس مختصر آپ بیتی کا اقتباس ہے جو جناب جنید احمد کی مرتبہ کتاب "شخصیات اور واقعات جن سے میں متاثر ہوا" میں شامل ہے۔

یہ تو ہوئیں کتابیں لیکن بعض رسائل بھی میری اس مہم میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ماہنامہ "علیگ" کراچی علیگ حضرات کی دلچسپی کے لئے ایک بہت ہی عمدہ پرچہ تھا، بڑے آب و تاب سے نکلا لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ دو تین شماروں کے بعد ہی ختم ہوگیا۔ میرے اس مجموعے کے جناب شجاعت علی خاں اور جناب علی مقصود ایڈووکیٹ کے مضامین "علیگ" کے پہلے شمارے (فروری ۶۸ء) کے مرہونِ منت ہیں۔

علی گڑھ کے نامور فرزند اور میرے ہم نام پروفیسر عبدالمجید قریشی کے مضمون "علی گڑھ میں میرے چالیس سال" کی پہلی قسط ماہنامہ "العلم" کراچی کے شمارہ اپریل تا

جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی جب کہ اس کی دوسری اور تیسری قسطیں پانچ سال بعد جنوری تا مارچ ۱۹۶۸ء اور اپریل تا جون ۱۹۶۸ء کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ یہ تینوں قسطیں اس رسالہ کے کوئی اسّی صفحات کی ضخامت پر مشتمل ہیں۔ پروفیسر صاحب کا اس مجموعے میں مشمولہ مضمون انہی اقساط کی کامیاب تلخیص ہے۔ الحاج محمد زبیر صاحب کا طویل مضمون "علی گڑھ میں میرے بیالیس سال" ماہنامہ "سرحد" کراچی کے شمارہ ہائے فروری ۱۹۶۴ء تا اگست ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا جس کی تلخیص میرے اس مجموعہ کی زینت ہے۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور چودھری محمد محمود علی خاں کے مضامین ہم نے بالترتیب "قومی زبان" کراچی شمارہ اپریل ۱۹۷۱ء، "جامعہ" دہلی شمارہ جولائی ۱۹۶۰ء، "تہذیب الاخلاق" لاہور شمارہ نومبر ۱۹۷۳ء سے حاصل کئے ہیں۔

جناب شاہ حسن عطا کا مضمون "علی گڑھ جو کبھی تھا" اخبار "حریت" کراچی میں مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء تا ۲۷ نومبر ۱۹۷۶ء نو قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کی تلخیص کو بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جناب نعمان احمد صدیقی کا مضمون مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۵۶ء کے اخبار "انجام" کراچی میں شائع ہوا تھا، وہ یہاں اصل صورت میں موجود ہے۔

چشتیاں، ضلع بہاولنگر — عبدالمجید قریشی

۲۰ نومبر ۱۹۷۷ء

ظہیر احمد صدیقی

نذرِ عقیدت

مادرِ درس گاہ کی خدمت میں

یہ کعبۂ عقل و دانش ہے یہ علم و ہنر کا مخزن ہے
تا حشر خزاں آئے نہ جہاں یہ گلشن ایسا گلشن ہے

اس بزم میں حق و صداقت کا پیغام سنایا جاتا ہے
اخلاق سنوارا جاتا ہے کردار بنایا جاتا ہے

اس علم کدے میں جینے کے آداب سکھائے جاتے ہیں
انسانیت عظمیٰ کے سبق انساں کو پڑھائے جاتے ہیں

گمراہیاں فطرتِ انساں کی اس محفل میں کھو جاتی ہیں
اخلاق کی قدریں اعلیٰ کردار میں ضم ہو جاتی ہیں

اس شمع سے اہلِ محفل کو ہستی کے شرارے ملتے ہیں
طوفانِ تمرد میں بھٹکے ملاح کو کنارے ملتے ہیں

یہ خطۂ خطۂ یوناں ہے یہ وادی وادی ایمن ہے
یہاں شمع علم و عرفاں کی گوشے گوشے میں روشن ہے

ہر شے میں جاری و ساری ہے سیدؒ کا فیض روحانی
تکمیل یہاں پا جاتی ہے ناپختہ سرشت انسانی

ہر لحظہ جلائیں پاتا ہے ادراک یہاں احساس یہاں
ہے صدق و صفا کا ذوق یہاں اور ضبط و رضا کا پاس یہاں

اس ارضِ پاک پہ شام و سحر انوار کی بارش ہوتی ہے
مٹی زرخیز یہ سونا ہے شبنم زرخیز یہ موتی ہے

اس علم کدے سے بن کے ساتھی انسان بنائے جاتے ہیں
لافانی عظمت شوکت کے عنوان بنائے جاتے ہیں

ہر دل میں خوشی کے نغمے ہیں ہر لب پہ ہیں یکجہتی کے نغمے
اس علم و ہنر کی بستی میں دیوانے بھی ہیں فرزانے

یہاں درسِ عمل بھی ملتا ہے اور ذوقِ نظر بھی ملتا ہے
عرفانِ خودی بھی ہوتا ہے اور سوزِ جگر بھی ملتا ہے

اللہ کرے یہ علم کدہ تا روزِ ابد آباد رہے
ہر آفت سے محفوظ رہے ہر خدشے سے آزاد رہے

"میں نے والدہ کو خرچ کے واسطے لکھا انہوں نے جواب دیا
یہاں کیا خزانہ گڑا ہے تم واپس چلے آؤ"

میر ولایت حسین

میں وسط جنوری ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ پہنچ گیا۔ اب میں اپنے دل میں خوش تھا کہ دہلی میں مجھ کو چار روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ علی گڑھ میں دس روپیہ ماہوار وظیفہ ملے گا۔ اچھی طرح گزر ہوگی مگر جب میں بورڈنگ ہاؤس کے مینجر مولوی محمد اکبر صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ بورڈنگ ہاؤس کی کس کلاس میں داخل ہوگے؟ میں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا بورڈنگ ہاؤس میں بھی کلاسیں ہوتی ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہاں بورڈنگ ہاؤس کے تین درجے ہیں اور ہر درجے کے جداجدا اخراجات ہیں۔ فرسٹ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں بیس روپیہ، سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں پندرہ روپیہ اور تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں دس روپیہ ماہوار فیس ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرلیا جائے۔ مینجر صاحب نے مجھ کو ایک کچے بنگلے کی کوٹھری میں جو دکھنیہ گیٹ کے قریب تھا، بھیج دیا۔ اب مغرب کا وقت ہوگیا تھا اور کوٹھری جو مجھ کو دی گئی تھی، صاف نہ ہوئی تھی۔ بنگلہ کے کمروں میں رہنے والے طلبا نے مجھ سے کہا کہ آپ آج رات ہمارے کمرے میں رہیں۔ چنانچہ رات کا کھانا انہوں نے مجھے تھرڈ کلاس کے باورچی خانہ سے منگاکر کھلایا اور رات کو اپنے کمرے میں سلایا۔

فرسٹ کلاس کے بورڈنگ ہاؤس کے طلبا کو کھانے میں صبح کو چائے توس مکھن ۹ بجے صبح کا کھانا جس میں گوشت دال اور روٹی ہوتی تھی ایک بجے ٹفن جس میں ایک طشتری فیرنی یا پراٹھا یا اسی قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی چار بجے شام کو چائے اور بعد مغرب شام کا کھانا ملتا تھا جس میں دال گوشت اور ہفتے میں دو بار پلاؤ اور ایک بار میٹھے چاول اور فیرنی

ہوتی تھی۔ سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس والوں کو ناشتے میں چائے اور دو بسکٹ ملتے تھے۔ باقی چیزیں فرسٹ کلاس بورڈنگ ہاؤس کی طرح ملتی تھیں۔ تھرڈ کلاس بورڈروں کو دو وقت کھانا ملتا تھا مگر پلاؤ، زردہ اور ناشتہ اور ٹفن نہیں ملتا تھا۔ مینجر بورڈنگ ہاؤس اس بورڈنگ ہاؤس کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے، مگر اس بورڈنگ ہاؤس کو ان کی توجہ کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ لڑکے عموماً نیک چلن اور محنتی تھے۔

دوسرے روز میں کالج کے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے فرسٹ ایر کلاس میں داخل ہوگیا۔ اس وقت مجھ کو شامل کرکے ہماری کلاس میں آٹھ طلبا تھے، چار ہندو اور چار مسلمان۔ ہم چاروں مسلمان بورڈر تھے۔ کلب علی بیگ، سخاوت حسین، سید عبدالباقی اور میں۔

عبدالباقی اور سخاوت حسین جو مجھ سے چند دن پہلے داخل ہوئے تھے، اُن کمروں میں سے ایک میں رہتے تھے جو مارلین کورٹ کے سامنے لان پر بنے ہوئے تھے اور ان میں رہنے والوں سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے کہا کہ اس بارک میں ان کے کمرے کے قریب ایک کمرہ خالی ہے، تم اس میں آجاؤ۔ چنانچہ میں اس کمرے میں چلا آیا۔

میں اپنے گھر سے صرف دس روپیہ لایا تھا اس میں سے میں نے کورس کی انگریزی کتابیں چار روپے بارہ آنے کی خریدیں۔ ایک روپے دو آنے میں کمرے میں بچھانے کے لیے چٹائی کا فرش اور چھ آنے میں تیل کا فتیلہ سوز خریدا۔ اس طرح جو رقم میں لایا تھا اس کا بیشتر حصہ خرچ ہوچکا تھا۔ میرے پاس ریاضی، تاریخ اور فارسی کی کوئی کتاب نہ تھی۔ بان کی ایک چارپائی اور ایک میز مجھے بورڈنگ ہاؤس سے مل گئی تھی۔ ان کے سوا میرے پاس کوئی فرنیچر نہ تھا۔ میں نے والدہ کو خرچ کے واسطے لکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہاں کیا خزانہ گڑا ہے، تم واپس چلے آؤ۔ میں نہایت پریشان تھا۔ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا اور کالج میں رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کلب علی بیگ نے مجھ کو پریشان دیکھ

کہ میری پریشانی کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ دہلی میں مجھے چار روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا
اور دو تین روپے ماہوار پرائیویٹ ٹیوشن سے مل جاتے تھے اس طرح میری گزر بسر ہو جاتی
تھی علی گڑھ میں دس روپے ماہوار وظیفے سے توقع تھی کہ اچھی گزر ہو جائے گی مگر یہاں
وظیفہ تو میرے ہاتھ آتا نہیں۔ وہ مینیجر بورڈنگ کے پاس آتا ہے میرے پاس متفرق
خرچ کے لئے کچھ نہیں گھر کو لکھتا ہوں تو والدہ جواب دیتی ہیں کہ واپس چلے آؤ اور میرا
واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کلب علی نے کہا کہ مولوی مشتاق حسین صاحب نواب
وقار الملک سے کہو کہ وہ تم کو کوئی پرائیویٹ ٹیوشن دلا دیں گے۔ شام کو پانچ بجے
کے قریب مولوی مشتاق حسین صاحب جو اس وقت اعزازی طور پر بورڈنگ ہاؤس کی
نگرانی فرماتے تھے گشت کرتے ہوئے آئے اور مجھ کو کمرے میں بیٹھا دیکھ کر فرمانے
لگے کہ کرکٹ کھیلنے کیوں نہیں گئے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو کرکٹ کھیلنا نہیں آتا۔ فرمایا کہ سیکھنا
چاہیئے۔ پھر میں چند قدم ان کے ہمراہ گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا کچھ فرمانا ہے؟
میں نے کہا ہاں عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہو۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو اسکول کے کسی طالب علم
کی پرائیویٹ ٹیوشن دلا دیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنا وقت دوسروں
کے ہاتھ بیچتے ہو۔ اس وقت کو اپنے پڑھنے کے کام میں کیوں نہیں لاتے؟ میں نے عرض کیا
کہ اگر میں اپنا تھوڑا سا وقت دوسروں کے ہاتھ فروخت نہ کروں گا، تو میرا سارا وقت
پڑھنے سے چلا جائے گا فرمایا کہ کیوں؟ میں نے عرض کیا میرے والد زندہ نہیں ہیں اور
والدہ مالی امداد کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کالج چھوڑ دو اور گھر واپس
چلے آؤ — میں دس روپیہ ماہوار کے بھروسے پر آیا تھا، مگر وظیفہ مجھ کو ملتا نہیں مینیجر صاحب
بورڈنگ ہاؤس کالج کے اخراجات میں محسوب کر لیتے ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کالج کے
مطالبات کیا ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ فیس تعلیم تین روپیہ فیس طعام پانچ روپیہ فیس معالجہ
چار آنے فیس کرکٹ چار آنے کرایہ کمرہ معاف ہے۔ اس طرح آٹھ روپے آٹھ آنے

مطالبات کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے ہیں اور ایک روپیہ آٹھ آنے ماہوار وظیفے میں بچتے
ہیں مولوی صاحب نے فرمایا کہ ڈیڑھ روپیہ تمہارے متفرق اخراجات کے لئے کافی نہیں؟
میں نے کہا کافی تو ہیں بشرطیکہ وہ مجھ کو ملا کریں۔ انہوں نے فرمایا میں مینیجر بورڈنگ ہاؤس
سے کہہ دوں گا کہ وہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار تمہارے وظیفہ میں سے تم کو دے دیا کریں۔
پھر تو تم کو پرائیویٹ ٹیوشن کی ضرورت نہ ہوگی میں نے عرض کیا کہ پھر تو ضرورت نہ ہوگی۔ اس
کے بعد میں نے عرض کیا کہ میرے پاس کتابیں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ جو کتابیں نہیں
ہیں ان کی فہرست مع کتاب کی قیمت کے ان کی خدمت میں بھیج دوں۔ دوسرے روز
میں نے کتابوں کی فہرست ان کی خدمت میں بھیج دی۔ کل قیمت بائیس روپے ہوتی تھی۔
مولوی صاحب موصوف حیدرآباد تشریف لے جانے والے تھے اور سید صاحب کی
کوٹھی پر مقیم تھے۔ انہوں نے مجھ کو سید صاحب کی کوٹھی پر بلا کر بائیس روپے دے دیئے؛
چونکہ مجھ کو مینیجر بورڈنگ ہاؤس سے ڈیڑھ روپیہ ماہوار وصول ہونے کی امید نہ تھی اس
لئے میں نے بائیس روپے اپنے پاس رکھے اور کتابیں نہ خریدیں۔ دوسروں کی کتابوں
سے اپنا کام نکالا۔ البتہ انگریزی پروفیسر کے ڈر سے انگریزی کورس کی کتابیں تمام
خرید لیں۔

اس وقت کالج میں مسٹر سڈنس پرنسپل تھے جن کو چھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی
تھی اور وہ فورتھ ایئر کو دو گھنٹے تھرڈ ایئر کو ایک گھنٹہ اور سیکنڈ ایئر کو ایک گھنٹہ روزانہ
انگریزی پڑھاتے تھے مسٹر سڈنس کالج کے پرنسپل اس وقت مقرر ہوئے تھے جبکہ وہ
اسکول کی جماعت ہشتم تک تعلیم دیتے تھے اور انہوں نے اس کو بی اے کلاس تک
ترقی دی۔ اس لئے ان کے عہد میں کالج کی کلاسوں میں بھی اسکول کی کلاسوں کی طرح
پابندیاں رہیں۔ کلاس کو خواہ وہ اسکول کی ہو یا کالج کی گرمی ہو یا جاڑا پورے پانچ
گھنٹے تعلیم ہوتی تھی۔ گرمیوں میں کالج چھ بجے صبح سے گیارہ بجے تک ہوتا تھا اور

جاڑوں میں دس بجے سے ایک بجے تک بعد ازاں ایک بجے سے دو بجے تک نماز
ظہر کے واسطے چھٹی ہوتی تھی پھر دو بجے سے چار بجے تک کالج ہوتا تھا جمعہ کے دن
۸ بجے سے ۱۱ بجے دن تک کالج ہوتا تھا اور عموماً جمعہ کا دن ہفتہ وار امتحان کی نذر ہوتا تھا
اس وقت علی گڑھ کالج میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کالج کی کلاسوں اور
اسکول کی دو اعلیٰ کلاسوں کو حتی المقدور انگریز ہی انگریزی زبان کی تعلیم دیں اور
کالج اسٹاف میں سوائے مسٹر سدنس اور کوئی انگریز نہ تھا۔ اس لئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر
مسٹر نسبٹ فرسٹ ایر کو ایک گھنٹہ روزانہ انگریزی اور ایک گھنٹہ روزانہ لاجک
پڑھاتے تھے اور اسکول کی جماعت نہم و دہم کو روزانہ دو گھنٹے انگریزی کی
تعلیم دیتے تھے۔ مسٹر نسبٹ متوقع تھے کہ طلبا اپنا سبق پورے طور سے تیار کر کے
لائیں اگر طالب علم کو کسی لفظ کے معنی نہ معلوم ہوں تو وہ خفا ہوتے تھے کہ تم نے اس
کے معنی ڈکشنری میں تلاش کیوں نہ کئے۔ وہ نوٹ لکھانا ناپسند کرتے تھے وہ کہا کرتے
تھے کہ میرا کام تم کو عبارت کا سمجھا دینا ہے پھر تم اس کو اپنے الفاظ میں امتحان میں ظاہر
کرو کہ تم اس عبارت کو سمجھتے ہو۔ اگر میں تم کو نوٹ لکھا دوں گا اور تم اس کو حفظ یاد
کر کے امتحان میں لکھ آؤ گے تو ممتحن جو میری عبارت پر نمبر دے گا وہ در اصل تمہارے
نمبر نہ ہوں گے۔

ہندوستانی اسٹاف میں مولوی امجد علی صاحب ایم اے لیکچرر فلاسفی اور بابو گوبند
پرشاد صاحب ایم اے لیکچرر ریاضی تھے اور ہر ایک کو دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔
بابو گوبند پرشاد پانچ گھنٹے روزانہ کالج میں کام کرتے تھے، بلکہ نماز ظہر کے وقت جب
وہ خالی ہوتے تھے تو اسکول کے بعض طلبا ریاضی میں اپنی مشکلات ان کے پاس لے
آتے تھے اور وہ اپنی نیکی کے باعث انکار نہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ان دو پروفیسروں
کے بابو بہاری لال ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر تھے جو فرسٹ ایر کلاس کو ریاضی اور تاریخ

اور سیکنڈ ایر کلاس کو تاریخ پڑھاتے تھے اور ساٹھ روپے تنخواہ پاتے تھے۔ مولوی محمد اکبر صاحب
پروفیسر عربی کی تنخواہ ستر روپیہ تھی۔ مولوی عبد الجبار صاحب پروفیسر فارسی کو چالیس
روپیہ ماہوار اور پنڈت شیو شنکر پروفیسر سنسکرت کو تیس روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اسی زمانے
میں مولوی عبد الجبار صاحب کو فارغ کر دیا گیا اور ان کی جگہ مولوی محمد شبلی نعمانی پروفیسر
فارسی مقرر ہوئے اور یہ محسوس ہونے لگا کہ فارسی زبان کا ماہر درس دے رہا ہے۔ مولوی
شبلی صاحب اور ان کے شاگردوں کی عمر میں زیادہ تفاوت نہیں تھا اس لئے مولوی صاحب
کا برتاؤ ان کے ساتھ دوستانہ تھا۔ سبق ختم ہونے کے بعد طلبا مولوی صاحب سے درخواست
کرتے کہ لحن داؤدی کے ساتھ کچھ سنائیے۔ مولوی صاحب کا کمرہ پرنسپل صاحب کے کمرے
کے قریب تھا۔ اس لئے اپنے کمرے کے سب دروازے بند کر دیتے تھے اور پھر
خوش آوازی کے ساتھ نظم پڑھتے تھے

جنوری ۱۸۸۳ء کے اواخر میں نواب سر سالار جنگ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد
دکن کالج کے معائنے کے لئے تشریف لائے چار گھوڑوں کی گاڑی میں داہنی طرف
نواب صاحب تشریف فرما تھے۔ بائیں طرف سر سید احمد خاں صاحب، سید حسین
بلگرامی صاحب نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری جو بعد ازاں عماد الملک کے خطاب
سے مشہور ہوئے، سامنے کی نشست پر تھے۔ سر سالار جنگ اور سید حسین بلگرامی حیدرآبادی
لباس میں تھے۔ وضع ایسی سادی تھی کہ کوئی شخص پہچان نہیں سکتا تھا کہ ہندوستان کا سب
سے بڑا اپنے زمانے کا مدبر کالج دیکھنے آیا ہے۔ گاڑی جب طلبا کی صفوں کے سامنے پہنچی
تو حسب معمول طلبا نے خوشی کا اظہار ہُرّے سے کیا اور تالیاں بجائیں۔ تالیوں کی بے ہنگام
آواز سے گھوڑے بدک گئے اور گاڑی کو لے بھاگے جو دس بیس قدم پہنچ کر بڑی مشکل
سے رکی خیر ہوئی کہ کوئی حادثہ نہ ہوا۔ سید صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے
طلبا کو منع کیا کہ تالیاں نہ بجائیں۔ اس کے بعد پھر حکم ہو گیا کہ جب کوئی اعلیٰ شخص

گاڑی میں سوار ہو کر کالج کے معائنے کے لئے آئے تو جب تک وہ گاڑی سے اُتر نہ جائے اور گاڑی انہیں اتار کر دُور نہ چلی جائے طلباء ہرا نہ کریں۔

۱۸۸۳ء میں بورڈنگ ہاؤس کے معاملات میں مولوی سمیع اللہ خاں کی مداخلت سے ناراض ہو کر مسٹر سڈنس پرنسپل نے استعفیٰ دے دیا۔ سید محمود اُن دنوں لندن میں تھے۔ لہٰذا ان کو لکھا گیا کہ وہ کالج کے لئے نیا پرنسپل تجویز کریں۔ چنانچہ مسٹر بیک کو جو کیمبرج یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اور یونیورسٹی کی یونین کے پریسیڈنٹ رہ چکے تھے علی گڑھ کالج کے لئے چھ سو روپیہ ماہوار پر پرنسپل مقرر کر کے سید محمود انگلستان سے اپنے ہمراہ لائے۔

مسٹر بیک بہت خلیق آدمی تھے طلباء سے بہت محبت سے پیش آتے تھے اور ان کے کمروں میں جاتے تھے۔ برخلاف دوسرے انگریزوں کے اُن کا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ طلباء پر سب سے زیادہ اثر اساتذہ کی علمی قابلیت کا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بیک صاحب میں کوئی خاص امتیاز نہ تھا وہ ریاضی کے گریجویٹ تھے مگر علی گڑھ کالج میں ان کو بی اے کلاس کو انگلش لٹریچر پڑھانا پڑا جس کے وہ ماہر نہ تھے۔ مسٹر سڈنس سابق پرنسپل گو ولایت کی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ سند نہ رکھتے تھے مگر انگریزی میں جو کتاب وہ پڑھاتے تھے اس میں اچھی طرح تیاری کر کے کلاس میں آتے تھے جب کہ بیک صاحب بعض اوقات کتاب کے ورق بھی کلاس میں کاٹتے تھے اس لئے طلباء اُن کے پڑھانے سے مطمئن نہ ہوتے تھے۔ بیک صاحب جب علی گڑھ آئے تو اُن کی عمر ۲۳ سال تھی بہت سے لڑکے ان کے ہم عمر اور بعض ان سے عمر میں بڑے تھے اس لئے طلباء اُن کو اپنے مثل لڑکا سمجھتے تھے اور زیادہ وقعت نہ کرتے تھے۔

سرسید نے ۱۸۸۵ء میں اسٹریچی ہال کی تعمیر کے لئے پانچ سو روپے فی کس چندے کی اپیل اور چندہ دہندگان کے نام اسٹریچی ہال میں کندہ کرانے کا اعلان کیا۔ تعمیر کا تخمینہ ساٹھ ہزار روپیہ تھا۔ سب سے اوپر اُس شخص کے نام کا کتبہ تجویز ہوا جو دس ہزار روپیہ

اسٹریچی ہال کی تعمیر میں دے گا۔ مگر یہ چوکھٹا آخر تک خالی رہا۔ سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں سید محمود نے اس پر سید صاحب کا نام "اسمہٗ احمد" کندہ کرایا۔

مارچ ۱۸۹۶ء میں جب میں الٰہ آباد سے امتحان بی اے دینے کے بعد واپس آیا تو مسٹر بیک نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر تم اس سال بی اے میں کامیاب ہو گئے تو اسکول میں ایک جگہ ساٹھ روپے ماہوار کی دی جائے گی کیا تم اس کو منظور کر لو گے؟ میں نے ہاں میں جواب دیا بعد ازاں میں اپنے وطن ریواڑی چلا گیا۔ مئی ۱۸۹۶ء میں جب امتحان کا نتیجہ آیا تو فقط میں اور سید محمد علی دو طالب علم پاس تھے۔ باقی فیل۔ بیک صاحب نے مجھ کو پاس ہونے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی اسکول میں ففتھ ماسٹری کا عہدہ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر پیش کیا جس کو میں نے منظور کر لیا۔

یکم جولائی ۱۸۹۶ء سے میں نے کالجیٹ اسکول میں ففتھ ماسٹری کا کام شروع کر دیا۔ چھٹی کلاس کو انگریزی حساب جغرافیہ اور جماعت ہفتم کو تاریخ جغرافیہ پڑھانا ہوتا تھا۔ جماعت ششم میں جو میری کلاس تھی بعض لڑکے عمر میں بڑے اور بدشوق تھے میں اُن کو سبق یاد کرنے کی تاکید کرتا اور نہ یاد کرنے پر سزا دیتا تھا وہ بُرا مانتے تھے اور مجھ میں اور ان میں کشمکش رہتی تھی پانچواں سوتوش ہنڈا چار یہ فورتھ ماسٹر جماعت ہفتم کو کثر مضامین پڑھاتے تھے میرا کمرہ ان کے کمرے سے ملحق تھا اور بوجہ گرمی دونوں کمروں کے بیچ کے دروازے کھلے رہتے تھے وہ اس کشمکش کو جو میرے اور چند بدشوق لڑکوں کے درمیان رہتی تھی دیکھتے تھے انہوں نے ازراہِ ہمدردی مجھ سے کہا کہ چونکہ وہ مجھ سے سینیر ہیں اگر وہ مجھ کو کسی تعلیمی معاملے میں مشورہ دیں تو مجھ کو بُرا نہیں ماننا چاہیئے پھر فرمایا جو لڑکے کلاس میں ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں ہم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں ان سے کوئی سوال نہیں کرتے گویا وہ ہماری کلاس میں نہیں ہیں اور اُن سے کہہ دیتے ہیں کہ خاموش بیٹھے رہو اس طریقہ پر مجھ کو بھی عمل کرنا چاہیئے۔ میں نے اس وقت تو اُن کی نصیحت کو مان لیا اور شاید ایک آدھ روز بدشوق

لڑکوں سے باز پرس نہ کی مگر پھر میری طبیعت نے نہ مانا اور اپنی عادت کے موافق لڑکوں بدشوق لڑکوں پر تشدد جاری رکھا آخر میں نائب آیا اور میری کلاس میں کوئی لڑکا ایسا نہ تھا جو کم و بیش کام نہ کرتا ہو سالانہ امتحان میں تقریباً سب پاس ہو گئے اور جماعت ہفتم میں ترقی دیئے گئے۔

یکم جنوری ۱۸۸۸ء کو سرسید احمد خاں کو کے سی ایس آئی کا خطاب ملا، سرسید کا پولیٹیکل لیکچر ملک میں شائع کیا گیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کی گئی۔

۲۹ فروری ۱۸۸۸ء کو سرسید کے خاندان ان کے دوستوں اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے واسطے نہایت خوشی کا دن تھا کیونکہ اس دن سرسید کے صاحبزادے جسٹس سید محمود کی شادی نواب خواجہ شرف الدین خاں کی دختر نیک اختر سے ہوئی جو سید محمود کے چچا تھے اس تقریب کی خوشی میں سید محمود نے پانچ سو روپے مدرسۃ العلوم کو نذر کئے۔

۱۵ مارچ کو سرسید نے دعوتِ ولیمہ کالج کے ڈائننگ ہال میں کی جس میں کالج کے تمام طلباء، اساتذہ اور سید صاحب کے احباب مدعو تھے۔ مولانا شبلی نے اس موقع پر قصیدہ پڑھا۔

اس سال ۱۸۸۸ء کے موسم سرما میں مسٹر بیک کے والد والدہ اور بڑی بہن ولایت سے علی گڑھ تشریف لائے۔ اسٹاف کی طرف سے ان کو ۲۰ نومبر کی شب سالار منزل میں ڈنر دیا گیا جس میں مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ بھی شریک تھے جو شراب نوشی کے خلاف کوشش کر رہے تھے۔ اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر بیک نے کہا کہ مسٹر کین یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اس کالج کے قاعدوں میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ کسی قسم کی منشیات کالج کے ڈائننگ ہال کے اندر نہ لائی جائیں۔

مسٹر بیک کے والد اور والدہ کی ہندوستان سے روانگی کے قریب سرسید نے

ممبران کالج کمیٹی کی طرف سے ایک نقرئی گلدان نذر کیا اور انہوں نے انگلستان پہنچ کر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے واسطے ایک بڑا گھنٹہ ارسال کیا جو اب کالج کے صدر دروازے وکٹوریہ گیٹ پر نصب ہے۔

گرمیوں کے موسم میں چاندنی رات میں طلباء پرنسپل سے تفریح کے لئے کچھ گانے بجانے کی اجازت لے لیتے تھے اور پرنسپل صاحب چونکہ ہمارے رسم و رواج سے واقف نہ تھے اور ان کے ہاں گانا ناچنا تفریح کی چیزیں ہیں وہ اجازت دے دیتے تھے اور مجھ کو چار و ناچار پرنسپل کے حکم کی پابندی کرنی پڑتی تھی لڑکے پندرہ پندرہ بیس بیس کی ٹولیوں میں کچی بارک کے صحن میں جمع ہو کر اور اپنے ساتھ گھڑے اور مٹکے لے جا کر بجاتے تھے اور بھنگ کا پیالہ اور شو کا منہ کالا گاتے تھے۔

"عجب ہے بھنگ کا پیالہ ، ہوا شو کا منہ کالا ، منہ کالا منہ کالا

بس اب درس و تدریس میں کیا دھرا ہے۔ کہاں تیری کسوٹ کدھر استرا ہے

بہادر علی یہ زمانہ برا ہے"

اتفاق سے ایک روز مولانا حالی بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوئے اور انہوں نے اس گانے کا شور سنا، دوسرے دن انہوں نے سید صاحب سے شکایت کی کہ آپ کا بورڈنگ ہاؤس اس قابل نہیں ہے کہ کوئی بھلا آدمی اگر اس میں قیام کرے اگر طلباء کے والدین اس ہوحق کو دیکھیں تو وہ کالج سے بدظن ہو جائیں گے اس لحاظ سے اس قسم کے ہنگامے بورڈنگ ہاؤس میں نہیں ہونے چاہئیں سید صاحب نے بیک صاحب کو نوٹس بھیجا کہ بورڈنگ کے احاطے میں گانا ناچنا قطعاً منع ہے اس وجہ سے پرنسپل صاحب نے اس قسم کی ہوحق کی اجازت دینی بند کر دی اور بورڈنگ ہاؤس کے قواعد میں اضافہ کر دیا کہ بورڈنگ ہاؤس میں گانا اور ناچنا منع ہے

ماہ فروری ۱۸۸۹ء میں سرسید نے علی گڑھ کے میلہ نمائش میں بینی ریڈنگ

تھیٹر کیا۔ اس تھیٹر کے واسطے سرسید نے نمائش کے میدان میں ایک عالی شان پنڈال
بنایا تھا جب پنڈال بن رہا تھا تو لوگ تعجب کرتے تھے کہ سرسید کو بڑھاپے میں یہ کیا
سوجھی ہے۔ دیکھیں اس تماشا میں کون راجہ اندر بنتا ہے اور کون سبز پری اور یہ بڈھے
کیسے ناچتے گاتے ہیں۔ بہت انتظار کے بعد آخر کار وہ رات آئی اور یہی ریڈنگ تھیٹر
ہوا۔ مجھ کو یاد نہیں کہ اس تھیٹر میں سب سے اعلیٰ ٹکٹ کس قیمت کا تھا مگر میں نے
متوسط درجے کا ٹکٹ پانچ روپے کو خریدا تھا اور ادنیٰ ٹکٹ ایک روپیہ کا تھا جو طلبا
کے واسطے نصف قیمت پر ملتا تھا۔ اس تھیٹر میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب ترکی
جنرل بنے تھے اور بعض طلبا کو ترکی سپاہیوں کی وردی پہنائی گئی تھی۔ آغا محمد حسین نے سرحدی
پٹھان کا روپ بھرا اور ایک دنبہ اسٹیج پر لائے۔ منشی محمد سعید خاں گڑھ کپتان نے ایک
سادھو کی شکل اختیار کی اور تلسی داس اور کبیر کے بھجن اور دوہے گائے جس سے حاضرین
بہت محظوظ ہوئے۔ مولوی شبلی صاحب نے اپنی نظم بہت خوش الحانی سے پڑھی اور اس
میں اس تھیٹر کے متعلق لوگوں کے قیاسات کو بیان کیا۔ مسٹر لیڈی کلکٹر اور بعض انگریزوں
نے بھی اس ادبی تھیٹر میں حصہ لیا تھا۔ آخر کار سرسید ایک چوغہ پہن کر اسٹیج پر آئے اور ایک
پُر اثر تقریر کی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کالج کے واسطے میں نے کیا نہیں کیا۔ لاٹری کے ذریعے
جوا کھیلا۔ گلے میں جھولی ڈالی دکان دکان بھیک مانگی اور اب ایکٹر بن کر اسٹیج پر آیا ہوں۔
مقصد یہی ہے کہ کالج کے واسطے کسی طرح روپیہ ملے۔

اس زمانہ میں علی گڑھ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ساٹھ روپیہ ماہوار پر کام شروع
کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے ساٹھ روپیہ ماہوار پر بطور اسسٹنٹ پروفیسر
ریاضی علی گڑھ کالج میں اپنی ملازمت کی ابتدا کی اور باوجود اپنی اعلیٰ قابلیت اور علم ریاضی
میں کلکتہ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں کا ایم اے اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا ڈی ایس سی ہونے کے
جب تک وہ ولایت نہ گئے علی گڑھ کالج میں ان کو ڈیڑھ سو روپیہ سے زیادہ تنخواہ نہ ملی

میں علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں بحیثیت سیکنڈ ہیڈ ماسٹر پورے پانچ گھنٹے روزانہ تعلیم
کا کام کرتا تھا۔ علاوہ ازیں اسکول اور کالج دونوں قسم کے بورڈنگ ہاؤسوں کی نگرانی میرے
ذمہ تھی۔ گیمس فنڈ کا آنریری ٹریژرر، علی گڑھ منتھلی کا آنریری مینیجر اس کے حصہ اردو کا آنریری
ایڈیٹر [illegible] بعدازاں کالج بک ڈپو کا آنریری مینیجر ہونے کی وجہ سے میں اپنے
دل میں سمجھتا تھا کہ علی گڑھ میں کام کی مصیبت سب سے زیادہ مجھ پر ہے مگر جب مسٹر ماریسن
پرنسپل کالج کو دیکھتا تھا کہ مئی اور جون کی سخت گرمی میں سات بجے صبح سے بارہ بجے
دوپہر تک پورے پانچ گھنٹے پڑھانے اور دفتر کا کام کرنے کے بعد سہ پہر میں تین بجے
سے پانچ بجے تک کالج کے دفتر میں آ کر کام کرتے ہیں اور پھر بیسیوں خط اپنے قلم سے
لکھتے ہیں تو میری تشفی ہو جاتی تھی۔

سرسید کے صاحبزادے جسٹس سید محمود کو قبل از وقت پنشن دے دی گئی اور وہ
علی گڑھ آ کر سید کے پاس رہنے لگے یہاں آ کر شراب میں کمی کر دی گئی مگر بالکل ترک نہیں
ہوئی تھی ان کا جسم بہت بھاری ہو گیا تھا مگر رنگ پیلا تھا۔ ایک روز شام کے وقت
سید صاحب اور سید محمود بیٹھے ہوئے تھے میں نے سید محمود سے کہا کہ آپ کسی
قسم کی ورزش نہیں کرتے اس لئے خون صالح پیدا نہیں ہوتا آپ کم از کم گاڑی میں
سوار ہو کر ہوا خوری ہی کر لیا کیجئے۔ چونکہ میں نے یہ بات سید صاحب کے مزاج کے
مطابق کہی تھی، اس لئے سید محمود خاموش رہے۔ سید صاحب نے فرمایا: محمود سنتے
ہو میر صاحب کیا کہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے ہاں سنتا ہوں بشرطیکہ میر صاحب میرے ہمراہ
چلا کریں۔ میں نے اقرار کر لیا چنانچہ دوسرے روز چار بجے شام کو مدرسہ سے فارغ ہو کر
ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگے بیٹھ جاؤ ابھی تو دھوپ ہے حقہ پی لو۔ میں بیٹھ گیا
حقہ پیا جاتے پی یہاں تک کہ چھ بجے کے قریب ملازم نے آ کر کہا کہ گاڑی حاضر ہے۔
کسی دن ملازم سے کہہ دیتے کہ آج تو مطلع صاف نہیں ہے ہم نہیں جائیں گے کسی دن

سوار ہوکر چلتے اور کچھ دور پھرنے کے بعد مغرب کے قریب کوٹھی پر واپس آجاتے۔ میں
رخصت ہونا چاہتا تو کہتے "ذرا دم تو لو ذرا بیٹھو ابھی پھر کر آئے ہو، میں کہتا گاڑی میں پھر
کر آیا ہوں پیدل نہیں چلا ہوں، جو تھک جاتا۔ وہ کہتے خیر ذرا دم تو لو۔ میں بیٹھ جاتا۔ سید محمود
غسلخانہ جاتے ہوئے سید صاحب سے کہہ جاتے "ابا جانی میر صاحب کو جانے نہ دینا"
آٹھ بجے کے قریب سید صاحب کا ملازم آکر اطلاع کرتا کہ کھانا میز پر آگیا ہے۔ میں
رخصت ہونا چاہتا تو سید محمود کہتے کہ آخر و ہناقی ہونا کھانا کھا کر جانا۔ میں کہتا کہ مجھ کو بورڈنگ
ہاؤس سے نکلے ہوئے بہت دیر ہوگئی ہے مجھ کو اس وقت بورڈنگ ہاؤس میں ہونا
چاہیئے وہ کہتے کہ بورڈنگ ہاؤس میں بھی کھانا ہی کھاؤ گے جیسے وہاں کھانا کھاتے ہو
یہاں کھاؤ۔ جب سید صاحب دیکھتے کہ بیٹے کو کھانا کھلانے پر اصرار ہے تو کہتے میر صاحب
کیا مضائقہ ہے بس کھانا کھا لیجئے۔ سید صاحب کے فرمانے پر میں خاموش ہو جاتا اور
کھانے کی میز پر جا بیٹھتا۔ کھانے کے وقت سید محمود بہت خاطر کرتے کھانے کے بعد
اچھے اچھے آم میرے سامنے رکھتے اور ہر طرح کی مدارات کرتے۔ سید محمود مجھ سے کہتے
کہ آپ ابا جانی کے سامنے حقہ نہیں پیتے۔ اب میرے کمرے میں چلئے اور حقہ پیجئے۔ میں
اُن کے ہمراہ اُن کے کمرے میں جا، حقہ پیتا اور چلا جاتا۔ یہاں تک کہ گیارہ بج جاتے اور
میں رخصت چاہتا تو سید محمود کہتے کہ ذرا دم تو لو میں سواری منگوا دیتا ہوں۔ رات کو پیدل کہاں
جاؤ گے۔ میں کہتا کہ مجھے سواری کی کیا ضرورت ہے۔ رات دن یوں ہی پھرتا ہوں مگر وہ نہیں
مانتے اور مسعود کی چھوٹی گاڑی منگواتے اور مجھ کو سوار کر کے رخصت کرتے یہ عمل مہینوں
جاری رہا۔

۱۸۹۵ء میں کالج میں غبن کا حال معلوم ہوا۔ اس غبن کی تحقیقات کے لئے مجھ کو
عابد علی بیگ کے ساتھ مامور کیا گیا۔ ہم نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا غبن ثابت کیا۔
سرسید نے کالج کا تمام سرمایہ بنک میں جمع کر دیا تھا۔ انگریزی دفتر کا ہیڈ کلارک

شام بہاری لال تھا وہ اپنے ہاتھ سے انگریزی میں چیک لکھ کر سید صاحب کے
سامنے پیش کرتا اور ان سے دستخط کرا لیتا۔ چونکہ سید صاحب انگریزی نہیں جانتے
تھے اور اس پر اعتماد کرتے تھے اس لئے انہوں نے کبھی چیک بک سے آمد و خرچ کا
مقابلہ نہیں کیا۔ غرض اُس نے سرسید کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ایک لاکھ ستر
ہزار روپے بنک سے نکال لئے۔ اچانک وہ فالج میں مبتلا ہوگیا اور بنک سے خطوط
آئے۔ تب غبن کے متعلق معلوم ہوا۔ شام بہاری لال پر مقدمہ چلا اور وہ حوالات میں فوت
ہوگیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس نے خودکشی کی اور بعض کہتے ہیں کہ فالج کے دورہ کی وجہ
سے اس کی موت واقع ہوئی۔ اس واقعے سے سرسید کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ آخر
دم تک فراموش نہ ہوا۔

۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کی شب میں گیارہ بجے کے قریب سید صاحب کی کوٹھی
کا چوکیدار آیا اور کہا کہ تم کو سرکار نے یاد کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ چھوٹے سرکار نے یاد کیا
یا بڑے سرکار نے؟ اُس نے کہا کہ بڑے سرکار کا انتقال کر گئے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا
کہ کب کا انتقال کر گئے؟ اُس نے کہا کہ نو بجے کے قریب۔ میں فوراً کوٹھی پر پہنچا۔ عجب سماں
دیکھا۔ وہ شخص جس کا احترام چند گھنٹے پہلے بڑے سے بڑا آدمی کرتا تھا اب وہ ایک
تودہ خاک بنا ہوا ہے اُس پہ ایک چادر پڑی ہوئی ہے اور بورڈنگ ہاؤس کا حافظ بیٹھا
ہوا کلام مجید پڑھ رہا ہے۔ لوگوں میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کاغذات اور کنجیاں
کس کے پاس رہیں۔ حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کہتے تھے کہ یہ قوم کی ملکیت میں رہنا چاہئے
رہیں اور سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد کہتے تھے کہ ہمارے پاس رہنی چاہئیں۔ آخر کار یہ
تصفیہ ہوا کہ نہ ہمارے پاس اور نہ تمہارے بلکہ بیک صاحب کے سپرد کر دی جائیں؛
چنانچہ بیک صاحب نے الماریوں کو مقفل کر کے ان کی کنجیاں اپنی جیب میں رکھ لیں۔
بعد ازاں بیک صاحب مجھے اپنے ہمراہ گاڑی میں لے کر کالج آئے اور وکٹوریہ گیٹ

کے سامنے کے حصہ باغ میں سید صاحب کے مقبرہ کی جگہ تجویز کی۔ اس کے بعد وہ اپنی کوٹھی پر چلے گئے اور میں واپس حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کی کوٹھی پر گیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ حافظ صاحب تو سید صاحب کے جنازے کے پاس قرآن مجید پڑھ رہے ہیں، لیکن ان کے عزیز سو رہے ہیں۔ دوسرے روز میں علی الصبح اٹھا تو معلوم ہوا کہ سید محمود صاحب نے مسجد میں سید صاحب کی قبر کھدوائی ہے۔ دو تین بجے کے قریب میں اور سید عبدالباقی سید صاحب کے جنازے پر جانے کے لئے نکلے ہی تھے کہ مولوی زین العابدین صاحب ملے انہوں نے مجھ سے کہا کہ سید صاحب کا نوکر عظیم میرے پاس آیا تھا اور سید صاحب کی تجہیز و تکفین کے لئے کچھ روپیہ مانگتا تھا۔ میرے پاس تو کچھ تھا نہیں میں نے اس کو نواب محسن الملک کے پاس بھیج دیا ہے۔ تم وہاں جاؤ اور اگر نواب محسن الملک کے ہاں سے عظیم کو کچھ مل گیا تو خیر ورنہ تم کچھ بندوبست کر دینا۔ ہم دونوں نواب محسن الملک کی کوٹھی پر گئے۔ نواب صاحب ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ سید صاحب کا نوکر عظیم کہتا ہے کہ وہ محمد احمد کے ملازم سے دس روپیہ قرض لینے کے لئے گیا تھا۔ محمد احمد صاحب کو معلوم ہوا، تو وہ اپنے نوکر پر خفا ہوئے۔ میں نے کہا کہ جناب ہم تو یہ سمجھے تھے کہ سید صاحب کے عزیز اور دوست سب موجود ہیں اگر ہم ان کی تجہیز و تکفین کے بارے میں کچھ پیش قدمی کریں گے تو آپ لوگ ناخوش ہوں گے ورنہ آرنلڈ جو ہمارا ہم مذہب اور ہم قوم نہیں ہے صرف چند سال اس نے ہمارے ساتھ اس کالج میں کام کیا تھا جب وہ کالج چھوڑ کر لاہور جانے لگا تو ہم نے اس کی الوداعی تقریب کے لئے کئی سو روپیہ چندہ جمع کر کے اس کو رخصت کیا۔ سید صاحب تو جاتے ہیں۔ ان کی تجہیز و تکفین کے واسطے روپیہ جمع کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم ان کی آخری رسوم کا انتظام کر دیں گے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ نہیں تم کو انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے۔ پھر کب چندہ

مانگنے آئیں گے۔ انہوں نے پچاس روپے عظیم کو دے دیئے۔ اس کے بعد سید صاحب کی تجہیز و تکفین ہو گئی۔ دوسرے دن تیسرے پہر کالج گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور مسجد کے شمال میں سید صاحب دفن کئے گئے۔ ہزارہا آدمیوں کا مجمع تھا ہر مذہب اور قوم کے لوگ اور ضلع علی گڑھ کے تمام عمائدین و رؤسا اور حکام گورنمنٹ شریک جنازہ تھے۔

۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو ہز میجسٹی امیر حبیب اللہ خاں صاحب والی کابل لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے ہمراہ کالج میں تشریف لائے امیر صاحب کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس کالج کے متعلق بہت سی باتیں سنی ہیں مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ سچ اور جھوٹ میں چار انگل کا فاصلہ ہے جو آنکھ اور کان کے درمیان ہے میں نے سنا ہے اور آنکھ سے دیکھنے آیا ہوں انہوں دینیات میں طلبہ کا امتحان لے کر کالج کی دینی تعلیم کی طرف سے اطمینان ظاہر کیا اس موقع پر مولانا حالی مرحوم نے قصیدہ پڑھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ع

عاقبت مقبولیت کالج بدیں غایت رسید

تربیت گاہِ غریباں شد گزرگاہِ شہاں

کالج کے ایک طالب علم علی الدین نے امتحان دینیات کے وقت تلاوت قرآن پاک کی انہوں نے تلاوت اس خوش الحانی سے کی کہ امیر صاحب اور تمام سامعین پر وجد طاری ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی ہوئی جس میں امراء اور معززین و حکام شامل ہوئے رات کو روشنی کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ہز میجسٹی نے بیس ہزار روپے عطیہ دوامی سالانہ اور ایک سال کا پیشگی عطیہ عنایت فرمایا۔ مختلف مقامات کے ہر درجے اور ہر طبقے کے لوگ جوق در جوق ایک مسلمان خود مختار بادشاہ کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ ان لوگوں کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا حالانکہ علی گڑھ میں

گورنر وائسرائے اور بڑے بڑے حکام آتے رہتے تھے لیکن ایسی خوشی کسی موقع پر دیکھنے میں نہیں آئی جو ہم مذہب بادشاہ کو دیکھنے میں آئی۔

۱۹۱۱ء میں میری ملازمت ۲۵ سال کی ہوئی تو ہیڈ ماسٹر اور دیگر ممبران اسکول و کالج اسٹاف نے مجھ کو تحفہ ایک سونے کی گھڑی مع زنجیر طلائی جس کی قیمت ساڑھے تین سو روپیہ تھی دی اور کچھ ظروف نقرئی بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ نے دیئے۔ پرنسپل صاحب نے میری خدمات کی بہت تعریف کی اور ۱۹۱۲ء میں جب شہنشاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کا دربار دہلی میں ہوا تو برٹش گورنمنٹ نے مجھ کو خان صاحب کا خطاب دیا۔

"وہ (پروفیسر آرنلڈ) سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے۔ میں نے کالج میں انہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے، سر پہ عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتا۔ کوئی دیکھے، تو یہ معلوم ہو کہ ملا جی کسی مسجد میں درس دینے جا رہے ہیں۔"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں میں کچھ چل چل نظر آئی۔ مسلمان شرفاء خصوصاً بڑے بوڑھے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھتے تو کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سیّد احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سیّد احمد خاں اُس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوعِ بحث تھے۔ اُن کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔ مولوی صاحبان اس ذکرِ عزیز کو اپنے وعظوں، مجلسوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ سننے والے اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشیے چڑھاتے۔ کوئی کہتا گردن مروڑی مرغی کھاتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ کوئی کہتا اس نے اپنا سر بیچ دیا ہے۔ مرنے کے بعد انگریز اس کا سر لے جائیں گے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ ان کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔ سر بکنے کا قصہ اسی بنا پر مشہور ہوا۔

میں یہ واہی تباہی سنتا رہتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں میں نے "تہذیب الاخلاق" دیکھے اور پڑھنے شروع کیے۔ اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں اُن سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کا مطالعہ کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ پہلے کانوں نے بہکایا تھا، اب آنکھوں نے جلوہ دکھایا، لیکن دور کے دیکھنے اور قریب کے دیکھنے میں فرق ہے۔ جب میں کالج پہنچا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخری دو سال میں زیادہ قربت

نصیب ہوئی اور سرسیّد علیہ الرحمۃ کو کام کرتے، ہم کلام ہونے، اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، بورڈنگ ہاؤس کی پیمائش کرتے، مسجد میں نماز پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے اور گرجتے دیکھا۔ اُن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

میں جب اوّل روز مدرسۃ العلوم مسلمانان ایم اے او کالج علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہاؤس میں پرنسپل صاحب کی عنایت سے کمرہ مل گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اک نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔ وہاں کے طالب علم، اُن کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات، وہاں کے اساتذہ، وہاں کا ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے، دنیا بدل گئی پھر ان کا مزاج بدلا۔ مسجد اور نمازیں اور مؤذن کی کڑک دار آواز، یہ سارا ماحول میرے لئے بالکل نیا اور عجب سا تھا۔ یہ بات ۱۸۸۹ء کی ہے۔ اُس وقت طالب علموں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ طالب علم ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے کے تھے۔ بعض اوقات ہندوستان کے باہر کے بھی آکر داخل ہو جاتے تھے۔ کوئی صوبائی امتیاز باقی نہ تھا۔ سب اُردو بولتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے۔ میرے ہم جماعت بنگالی چاٹگام کے اس قدر صاف اور بے تکلف اُردو بولتے تھے کہ میں ابتدا میں یہی سمجھتا رہا کہ یوپی کے کسی مقام کے رہنے والے ہیں۔ ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی وہ قومیت کی جھلک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سرسیّد احمد خاں کا طفیل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور اس احساس کو تقویت اُن اکابرِ قوم سے پہنچی تھی جو کسی نہ کسی تقریب سے کالج میں یا سیّد صاحب کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔

اسکول میں سب معلم ہندوستانی تھے، سوائے ہیڈ ماسٹر ہورسٹ صاحب کے جو بلند قامت گراں ڈیل شخص تھے اور کسی فوج کے کرنیل معلوم ہوتے تھے۔ سیکنڈ ماسٹر میر ولایت حسین صاحب تھے جو بڑے محنتی اور فرض شناس تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی

نگرانی انہی کے ذمے تھی اور وہ بورڈنگ ہاؤس ہی کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اُن
کے ذمے اور بھی کئی کام تھے۔ سر سید، محسن الملک اور دیگر اکابر اُن کی بڑی عزت
کرتے تھے۔ میرے حال پر بڑی مہربانی فرماتے۔ وہ ہماری جماعت کو ریاضی پڑھاتے
تھے۔ ایک دن میں کسی وجہ سے اُن کا کام کر کے نہ لایا، وہ بہت خفا ہوئے اور فرمانے
لگے: "میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تمہاری تعریف کرتا پھرتا ہوں اور تم
ہی میرا کام کر کے نہیں لاتے۔" مجھے بہت شرم محسوس ہوئی اور اس کے بعد سے میں نے
اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

اسکول کے معلمین میں مولوی خلیل احمد صاحب کی سج دھج نرالی تھی۔ وہ عربی کے
استاد تھے۔ چھوٹے قد کے، ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ، کرتا۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں
رہتے تھے۔ اُن کا کمرہ وہاں تھا جہاں پکی بارک ختم ہو کر کچی شروع ہوتی ہے۔ دونوں کے
بیچ میں تھا۔ عربی کے فاضل تھے۔ اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر بھی اُن کی نظر تھی۔ اپنے
کمرے میں بیٹھے یا لیٹے کتاب آنکھوں سے لگائے پڑھتے رہتے تھے۔ جب کمرے کے
سامنے سے کسی کے آنے جانے کی آہٹ سنتے تو کہتے "کون؟" کوئی طالب علم یا استاد
ہوا تو چپ ہو جاتے اور جو کوئی بیرا یا ملازم ہوتا تو کہتے "چلم بھر لاؤ!" بہت سیدھے
سادے شخص تھے۔ تنخواہ ملتی تو چپکے سے ایک طرف دری کے نیچے رکھ دیتے۔ بیرا کچھ نہ
کچھ اس میں سے چرا لیتا۔ ایک بار انہوں نے کہیں سے آم منگائے اور کمرے میں رکھ دیئے۔
لڑکوں کو معلوم ہوا تو ان کی غیر حاضری میں چٹ کر گئے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ آم غائب
ہیں۔ کہنے لگے: "آم کھائے مضائقہ نہیں، گٹھلیاں تو چھوڑ جاتے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے
کے لئے منگائے تھے۔" کبھی چھٹیوں کے بعد گھر سے آتے تو بہت سی کھیر یا ساول لاتے
اور اپنے بعض طالب علموں کو کھلاتے۔ کھانے کے بھی شوقین تھے۔ جب میں مڈل میں پڑھتا
تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ میں آکر میں نے دوسری زبان فارسی لے لی۔

میں خوش تھا کہ میں نے فارسی لے لی اور اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے صاحبِ ذوق
اُستاد ملے۔ اُردو بیچاری کی اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں رسائی نہ تھی۔
مولوی خلیل احمد صاحب مجھ سے کہا کرتے کہ عربی پڑھ لو یہ تمہارے کام آئے گی۔ چنانچہ
انہوں نے مجھے "الف لیلہ" پڑھانی شروع کی۔ کہتے تھے کہ اس کی زبان بہت فصیح اور
سادہ ہے اور اس میں قسم قسم کے معاملات کا ذکر آتا ہے۔ میں عربی سے اُردو میں اور
اُردو سے عربی میں ترجمہ کرتا، یعنی الف لیلہ کا جو سبق پڑھتا اس کی کچھ سطروں کا اُردو
میں ترجمہ کرتا اور دوسرے روز اس کا ترجمہ عربی میں کرتا۔ صرف و نحو کے قواعد وہ
مجھے زبانی لکھوایا کرتے تھے۔ خوب آدمی تھے۔ بڑا اچھا ہوا کہ وہ اسکول سے کالج میں لے
گئے۔ جو ان کا صحیح مقام تھا۔ بعد میں انہیں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا۔

انٹرنس کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں کالج کی جماعتوں میں چلا گیا۔ کھیلوں سے مجھے
کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کبھی کسی کھیل میں شریک نہ ہوا۔ مسٹر بیک، پرنسپل، کئی بار مجھے
اپنے کمرے سے پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے۔ میں ساتھ ہو لیتا مگر فیلڈ میں پہنچ
کر غچہ دے جاتا اور کسی دوسری طرف نکل جاتا۔ یونین کے الیکشن میں بڑا ہنگامہ ہوتا مگر
میں یونین کے جلسوں اور تحریکوں سے بھی ہمیشہ الگ ہی رہا۔ کالج میں کئی انجمنیں تھیں۔ میں نے
ان میں کبھی شرکت نہیں کی۔ البتہ "اخوان الصفا" جس کے بانی پروفیسر تھامس آرنلڈ تھے
میں دو ایک مضمون پڑھے۔ ایک مضمون میں نے سینٹ پال پر پڑھا۔ اس دن سے لڑکے
مجھے سینٹ پال کہنے لگے۔ مطالعے کا شوق مجھے ابتدا سے تھا۔ تعطیلوں میں طالب علم
اپنے وطن چلے جاتے تھے۔ چھٹیوں میں پڑھنے کے لئے کچھ طالب علم لائبریری سے
کتابیں مستعار لے جاتے تھے۔ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا۔ میں بہت سی کتابیں
مختلف نوعیت کی منتخب کرتا تو آرنلڈ صاحب کہتے "تمہیں بڑی ہوس ہے۔ اتنی ساری
کتابیں کیسے پڑھو گے؟" وہ ٹھیک کہتے تھے۔ میں سب کتابیں کہاں پڑھ سکتا تھا۔ بعض دلچسپی

کی دلچسپی لے آتا تھا۔

کالج میں تمام پروفیسر سوائے عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی اور عربی کے پروفیسر بالترتیب مولانا عباس حسین اور مولانا شبلی تھے۔ ریاضی کے بابو مکرجی۔ مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مؤرخ تھے اُن کی جماعت میں بیٹھ کر دل خوش ہوتا تھا۔ وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔

مولانا عباس حسین نرے مُلا تھے۔ ادبی ذوق سے عاری البتہ ضلع جگت کے استاد تھے۔ ضلع بولنے سے کبھی نہ چوکتے اور جو کوئی ان کے جواب میں ویسا ہی بول جاتا تو باغ باغ ہو جاتے۔ ایک بار کالج کی تنخواہوں میں بہت دیر ہو گئی۔ مولانا شبلی شکایت کرنے لگے کہ آج کل روپے کا بہت توڑا ہے۔ روپے کے ساتھ توڑے کا لفظ سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ ساری تکلیف بھول گئے۔ ریاضی کے پروفیسر بابو مکرجی بہت ہی شریف اور نیک انسان تھے۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں میرا ایک مضمون ریاضی بھی تھا اس لئے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حاضری لیتے وقت میرا نام آہدل ہوک کہہ کر پکارتے تھے۔ بنگالی زبان میں ہر لفظ گول ہو جاتا ہے۔ گھوڑی گھوڑی اور بنگالی بنگولی ہو جاتا ہے حق بھی ہوک ہو جاتا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی حیثیت کالج میں خاص بلکہ امتیازی تھی۔ وہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے میں نے کالج میں انہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ بدن پر عبا و قبا اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے سے دستے کی چھڑی لئے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آجاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو کہ ملّا جی کسی مسجد میں درس دینے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے قبل میرے کمرے میں آجاتے اور مجھے سیر کے لئے ساتھ لے جاتے۔

راستے میں پوچھتے کہ آج کل کیا کر رہے ہو کیا کچھ لکھ رہے ہو؟ جب میں بتاتا کہ فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث اور بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے۔ ایک بار ایسی ہی سیر میں جب اُن کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ میں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو پوچھا مجھے اس کا خیال کیسے پیدا ہوا اور اس کے لئے مجھے مسالا کہاں سے ملا؟ دوسرے دن انہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر بھیجے جن میں پروفیسر براؤن نے بابی مذہب پر مضامین لکھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ میں عالمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں پائی جاتی تھیں۔

ہمارے پرنسپل تھیوڈور بیک چھریرے بدن کے بڑے مستعد تیز آنکھیں چمکتی ہوئی ذہین شخص تھے۔ اس منصب کے لئے ان کا انتخاب سید محمود نے کیا تھا کیمرج یونیورسٹی کے ممتاز گریجویٹوں میں سے تھے اور وہاں کی یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ جب یہ کالج میں آئے تھے تو بالکل نوجوان تھے اور ہم سے خوب گھل مل گئے کچھ عرصے کے بعد جب انہیں ہندوستان کی ہوا لگی اور یہاں کی تاریخ و حالات سے زیادہ واقفیت ہوئی تو رفتہ رفتہ ان کا جھکاؤ سیاست کی طرف ہو گیا۔ اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ سرسید کی مخالفت سے ملک میں ایک عجیب ہنگامے کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا مسٹر بیک کو یہ زریں موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے کانگریس کے خلاف خوب زہر اگلنا شروع کیا۔ مسلمان بہت خوش ہوئے۔ مسٹر بیک میں کچھ کچھ اینگلوانڈین رنگ پیدا ہو چلا تھا وہ بجائے مائی آرڈر کے مائی حکم فرمانے لگے تھے۔ حکم میں جو تحکمانہ شان ہے وہ آرڈر میں کہاں؟ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا تھا اور ہر ہندوستانی کو اپنی رعایا۔ جب تک سرسید رہے یہ دبے رہے ان کے مرنے کے بعد یہ کھل کھیلے اور کالج کے ٹرسٹیوں تک کو طفلِ مکتب سمجھنے لگے اور ان پر حکم چلانے لگے۔ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ تھا

اور اعلیٰ حکام سے راہ و رسم تھی اس لئے ٹرسٹی بھی ان سے ڈرتے تھے۔ میرا یہ گمان ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط نہیں کہ وہ مسلمانوں سے اپنی قوم کے کام لینا چاہتے تھے اتفاق سے اسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے۔ کرزن زبردست امپیریلسٹ تھے ان کے دماغ میں شہنشاہیت کی بُو سمائی ہوئی تھی۔ مسٹر بیک ان سے جا کر ملے۔ کرزن بھی کیمبرج کے نامور گریجویٹ تھے اور یونیورسٹی یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ یہ کرزن سے شملے میں پینگیں بڑھا رہے تھے کہ وہاں پیچش سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر جیتے رہتے تو کرزن کی حکومت میں بڑے آدمی ہوتے اور بڑا مقام حاصل کرتے۔ ایک مشہور ہندی دوہے کا ٹکڑا "گھر تیرا نا گھر میرا چڑیا رین بسیرا رے" انہیں بہت پسند تھا اور اکثر پڑھا کرتے تھے یہی ان کی قبر پر کندہ ہے۔

ابھی مجھے کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وکٹوریہ گیٹ سے داخل ہوتے ہی جو پکی بارک شروع ہوتی ہے اس کے برآمدے میں کچھ طالب علم کھڑے ہیں اور ان کے بیچ میں مسٹر بیک تشریف رکھتے ہیں طالب علموں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی فردیں تھیں جن پر ناموں کی فہرست تھی۔ طالب علم یہ فہرست مسٹر بیک کو دکھا رہے تھے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ طالب علموں نے شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی۔ اُس زمانے میں سرسید انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے ناموں کی فہرستیں انگلستان کی پارلیمنٹ کو بھیج رہے تھے۔ یہ طالب علم مسٹر بیک سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ان فردوں پر نمازیوں سے یہ کہہ کر دستخط لئے کہ ہندو گاؤکشی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور قانون پاس کرانا چاہتے ہیں۔ ہم اس کے خلاف گورنمنٹ میں معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر بیک یہ سن کر ہنسنے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور افسوس ہوا کہ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار انگریز ایک ایسے فعل پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے جو دیانت اور راستی کے خلاف ہے۔ انگریز بلاشبہ معاملات میں

بہت احتیاط اور دیانت سے کام لیتا ہے لیکن قومی مفاد کا معاملہ آتا ہے تو ضمیر، انصاف اور راستی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہمیں اس کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان کے بعض سرحدی اضلاع کا تنازعہ چکانے کے لئے انگلستان کی ہائی کورٹ کے ایک جج کو حکم بنایا گیا اور یہ قرار پایا کہ یہ جو فیصلہ کرے گا وہ ہر دو فریق کو تسلیم کرنا پڑیگا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ مسٹر ریڈکلف انگلستان کی ہائی کورٹ کا جج ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کریگا جو راستی اور انصاف کے خلاف ہو۔ اُس نے جو فیصلہ کیا وہ ہمارے سامنے ہے پاکستان اُس جان کو رو رہا ہے اور نہ معلوم کب تک روتا رہے گا۔ بعد میں قائد اعظم نے اس فیصلہ کے خلاف بہت کچھ سخت سُست لکھا اور لعنت ملامت کی لیکن کیا ہوتا ہے زبان دے چکے تھے ماننا ہی پڑا۔

مسٹر بیک مسلمانوں کی سرشت سے خوب واقف ہو گئے تھے اور ان کے بھانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے کبھی عبا اور ترکی ٹوپی پہنے آ پہنچتے یا کانفرنس کے جلسے میں تقریر کرتے کرتے مسدس حالی کا کوئی بند انگریزی لہجہ میں پڑھتے تو مسلمان خوشی سے اچھل پڑتے۔ ان کا پورا نام تھیوڈور بیک تھا۔ مسلمان تھیوڈور بیگ کہنے لگے۔ البتہ ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ انہیں طالب علموں سے بہت ہمدردی تھی۔ اُن کی بہبودی کے لئے یا نوکری دلانے میں کوشش کرتے یا جب کبھی پولیس یا ریلوے اسٹیشن والوں سے لڑکوں کا جھگڑا ہو جاتا اور مار پیٹ کی نوبت آ جاتی تو مسٹر بیک ہمیشہ اپنے طالبعلموں کی حمایت کرتے۔

کالج جب نیا نیا قائم ہوا تو سرسید کا یہ معمول تھا کہ صبح کو کالج کی عمارت باغ وغیرہ دیکھنے آتے۔ اُس زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل تھا اور آس پاس کے

کروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں سیّد صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس سے اتر گئے ہیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھے فرمایا "اس کے ساتھ مت پھرا کرو تم کو شیعہ کرے گا"۔ میں نے کہا حضرت اب تو لوگ شیعہ رہے دشمنی۔ میرا اشارہ اس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے تھے اور اُن سے منسوب کرتے تھے۔ فرمانے لگے "ارے ایسا بنا لو تو جانوں!"

سیّد محمود کی چیف جسٹس (الٰہ آباد ہائی کورٹ) سے اَن بن ہو گئی تھی اور وہ استعفیٰ دے کر علی گڑھ آ گئے تھے۔ میں جو ایک مرتبہ اُن سے ملنے کے لئے گیا تو مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ معلوم ہوا کہ وہ چیف جسٹس کے الزامات کا جواب لکھ رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے ان کے خلاف گورنمنٹ میں ۵۰ صفحے کی رپورٹ بھیجی تھی۔ سیّد محمود نے اُس کی تردید میں پانچ سو صفحے کا جواب لکھا۔ میں اس میں کبھی کبھی شریک ہو جاتا تھا، مثلاً کسی حوالے کی تلاش کرنے میں یا کسی اقتباس کی نقل کرنے میں۔ تعلیم پر کتاب بھی انہوں نے اسی زمانے میں تالیف کی۔ ایک اور اچھی اور مفید کتاب بھی شروع کی اور وہ "محمڈن لا" تھی۔ اس کے پروف کئی بار میرے سامنے آئے۔ میں روزانہ سہ پہر کو سیّد محمود کے پاس چلا جاتا۔ جس روز دیر ہو جاتی تو آدمی بھیج کر بلا لیتے۔ رات کے کھانے کے لئے روک لیتے۔ اس طرح کوئی ڈیڑھ سال شب کا کھانا میں سیّد صاحب اور سیّد محمود کے ساتھ کھاتا رہا۔ کھانے پر کبھی کبھی ایک آدھ مہمان بھی شریک ہو جاتا۔ کھانے کی صحبت بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد پھر سیّد صاحب کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف امور اور موضوعات پر گفتگو رہتی۔ کبھی چائے آتی تو سیّد محمود ایک پیالی مجھے دیتے۔ میرے زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا۔ میں ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا، تو وہ میری چائے پی لیتے۔ گالیاں بھی کبھی کبھی خوب دیتے تھے۔ ایک بار مولانا شبلی سے کہنے لگے

"مولانا آپ بہت دن سے اِدھر نہیں آئے۔" مولانا نے کہا "آپ گالیاں بہت دیتے ہیں"۔ سیّد محمود نے کہا "مولانا میں آدمی کو دیکھ کر گالی دیتا ہوں"۔ وہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ افسوس شراب نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ رات کو جب میں اُن کے پاس بیٹھا ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ غسل خانے میں جاتے اور پی کر چلے آتے۔

میں غالباً ۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اُس زمانے میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا، بلکہ بورڈنگ ہاؤس ہی میں مقیم رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مولوی صاحب اُس زمانے میں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی "یادگارِ غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ بات میں بات نکل آتی ہے جب "حیاتِ جاوید" شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے ایک میرے لئے دوسرا مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا مولانا شبلی کے لئے جو اتفاق سے اس وقت حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے یہ کتاب لے جا کر اُن کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا شبلی نے کتاب دیکھتے ہی فرمایا "یہ کتاب کذب و افترا کا آئینہ ہے"۔ مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دی۔ ان کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا۔ اس کے برخلاف مولانا حالی بڑے صاحب دل آدمی تھے۔ مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت و خصائل کا بزرگ ابھی تک نہیں ملا۔

۱۸۹۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ میں ہوا۔ اسی سال اور اسی کانفرنس میں مسعود (سر سیّد راس مسعود) کی بسم اللہ ہوئی۔ اس تقریب میں کانفرنس کے تمام نمائندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے۔ تقریب کے خاتمے پر شیرینی تقسیم ہوئی۔ ان میں موتی چور لڈوؤں کا مزا مجھے ابھی تک یاد ہے۔

ایک روز میں سید محمود کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مسعود اندر گھر سے نکل کر آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ اب بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے؟ کہنے لگے میں اسے خود پڑھاؤں گا۔ محمود تو کیا پڑھاتے دادا ہی ان کے پڑھنے لکھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ ایک سال میں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا۔ ایک دن سید صاحب نے مولوی حمیدالدین اور مجھ سے فرمایا کہ میرے کتب خانہ کی کتابیں بہت بے ترتیب ہو گئی ہیں۔ کسی وقت آکر انہیں ترتیب سے لگا دو۔ ایک روز دوپہر کو اسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کر رہے تھے۔ اور سید صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ مسعود ان کی بغل میں لیٹا ہوا تھا۔ اتنے میں سید صاحب نے اپنی بھاری گھمبیر آواز میں مسعود کو لوری سنانی شروع کی۔ ہمیں ان کے گانے کی آواز سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور پیچھے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے۔

میرے زمانے میں بورڈروں کی تعداد کوئی تین سو تھی۔ ہندو طالب علم بھی تھے لیکن زیادہ تر ڈے سکالر تھے۔ شہر سے پڑھنے آتے تھے۔ میرے ہم جماعت بھی کئی ہندو تھے۔ میرے دوسرے ہم جماعت جنہوں نے بعد میں نام پایا اور مشہور ہوئے یہ تھے: ڈاکٹر ضیاءالدین احمد، مولوی حمیدالدین فراہی، مولوی ظفر علی خاں، حافظ ولایت حسین، سید محفوظ علی بدایونی، شیخ عبداللہ (بانی گرلز کالج علی گڑھ)۔ انٹرنس میں سیٹھ یعقوب حسن (مدراسی) میرے ساتھ پڑھتے تھے لیکن انٹر میں کامیاب ہونے کے بعد وہ کالج چھوڑ کر چلے گئے۔ سوائے شیخ عبداللہ صاحب کے باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے۔ شیخ عبداللہ صاحب بھی اس قدر ضعیف اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کام سے معذور ہیں۔

وہ کالج جو کبھی مورد لعن و طعن تھا وہی آخر کار مسلمانان ہند کی تعلیم و تہذیب اور سیاست کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے جو آواز اٹھتی وہ تمام مسلمانان ہند کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں

کہ مسلمانوں میں بیداری اور حیاتِ نو پیدا کرنے میں اس کالج نے جو کام کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

"ایک مرتبہ ایک طالب علم نے وڈننگ ہال کی دیوار پر جلی حروف میں لکھ دیا ؎

کوئی موتی کے صدقے ہو کوئی ہو لعل کے صدقے
ہم اپنی خشک روٹی بن بگھاری دال کے صدقے

سرسید علیہ الرحمۃ کی اس شعر پر نظر پڑی تو بڑے محظوظ ہوئے"

جناب شجاعت علی خاں

میں مضافات دہلی کے مشہور قصبے ججھر کے افغانان یوسف زئی ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے پڑدادا مولوی غلام رسول خاں صاحب تھے اور دادا مولوی غلام محمد خاں صاحب اور والد دوست محمد خاں صاحب یہ سب اپنے خاندان اور برادری میں معزز اور مشہور تھے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ملازمت سرکاری سے منسلک رہے۔

میں ۱۲ رجب المرجب ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۷۴ء بمقام ججھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے بزرگوں سے گھر پر حاصل کی۔ میرے دادا مولوی غلام محمد خاں صاحب ناگ پور میں انسپکٹر پولیس تھے۔ ان کی وجہ سے میرے والد دوست محمد خاں بھی وہاں جاکر پولیس میں ملازم ہوئے۔ بعد میں مجھے بھی وہاں جانا پڑا، میں نے اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول وہیں سے پاس کیا اور بعد ازاں مزید حصول تعلیم کے لیے ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ گیا۔ مجھے پکی بیرک کے کمرہ نمبر ۱۹ میں جگہ ملی۔ میرے کمرے کے برابر نمبر ۱۸ میں مراد آباد کے نوابزادہ عبدالعزیز خاں رہا کرتے تھے۔ کمرہ نمبر ۲۰ میں احسان الحق صاحب اور چودھری خوشی محمد خاں ناظر رہا کرتے تھے۔ ان لوگوں سے میری بہت گہری دوستی تھی۔ ہم لوگ مذاق میں احسان الحق صاحب کو شیطان الحق کہا کرتے تھے اور خوشی محمد خاں صاحب کو لانگ فیلو کہا کرتے تھے کیونکہ یہ بہت خوش گو شاعر تھے ہم سب ان کو اپنے حلقہ احباب میں ہمیشہ شریک رکھتے تھے۔

میرے دوران قیام علی گڑھ میں کالج کی کلاسیں پکی بیرک میں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں تین بیرکس، پکی بیرک، کچی بیرک اور نئی بیرک کے نام سے تھیں۔ نئی بیرک مسجد

سے ملحق تھی کالج کے بڑے احاطے کے اندر لیڈن طلبا ر اسکول کی عمارت پروفیسروں اور
ماسٹروں کے بنگلے اور چھوٹے چھوٹے مکانات پختہ بنے ہوئے تھے جن میں مولانا حالی،
ڈپٹی نذیر احمد اور نواب وقار الملک وغیرہ آکر رہا کرتے تھے۔ کالج کا بیرونی احاطہ پکا بنا
ہوا تھا جس کی سرحد صاحب باغ سے ملتی تھی۔ اس زمانے میں مسٹر تھیوڈور بیک کالج کے
لائق پرنسپل تھے۔ مسٹر تھیوڈور ماریسن اور مسٹر آرنلڈ انگریز پروفیسر تھے۔ علاوہ ازیں مولانا شبلی
نعمانی، مولانا عباس حسین اور مسٹر جادو چند رچکرورتی وغیرہ پروفیسر ہندوستانی تھے۔ کالج کے
پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک کا ایک ذاتی خط ابھی تک میرے پاس موجود ہے جو انہوں نے میرے
خط کے جواب میں شملہ سے اکتوبر ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا۔

میں نے علی گڑھ سے ۱۸۹۵ء میں امتحان انٹرنس پاس کیا اور چند ناساز گار خانگی
حالات کی وجہ سے وہاں سے رخصت ہوا۔

اپنے زمانۂ قیام علی گڑھ۔ ۱۸۹۳ء میں ڈائننگ ہال کا اسٹرائک ہونے کی وجہ
سے بورڈروں، استادوں اور بزرگوں میں کافی مشہور ہوا تھا۔ جولائی کو میں بیمار تھا اور بیمار
لڑکوں کو ڈائننگ ہال میں SICK TABLE پر کھانا دیا جاتا تھا۔ جب میں کھانے
کی میز پر گیا تو میرے پیالے میں مرغ شوربہ لایا گیا جس میں ایک کالا بال نکلا۔ میں نے
ملازم سے کہا کہ اس سالن میں بال ہے تم جاکر اس کو بدل لاؤ۔ اس نے دوسرا پیالہ سالن
کا لاکر دیا۔ اتفاق سے اس میں مکھی نکلی پھر میں نے اس کو بھی تبدیل کرنے کو کہا جو وہ
واپس لے گیا۔ بعد میں منشی عبدالکریم نے جو باورچی خانہ کا انچارج تھا خود تیسرا پیالہ سالن کا لاکر
دیا اور کہا کہ نمبر ۱۹ یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے کہ تم کبھی سالن میں بال بتاتے ہو اور کبھی مکھی اور
کہا کہ اگر کھانا ہے تو کھایئے ورنہ چلے جایئے اس پر میں نے غصے میں آکر سالن کا پیالہ اس
کے سینے پر اٹھا کر مارا اور ڈائننگ ہال سے واک آؤٹ کر گیا۔ میرے اس طرح کرنے
سے ڈائننگ ہال کے تمام لڑکوں نے واک آؤٹ کر دیا اور تمام لڑکے کئی وقت کھانے

پر ڈائننگ ہال نہیں گئے۔ جب سر سید احمد خاں صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے لڑکوں
سے کہہ کر مجھے بلایا اور حالات معلوم کئے جس پر میں نے کہا کہ ملازم منشی میرے ساتھ گستاخی
سے پیش آیا۔ ہم لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں نہ کہ ملازموں سے اپنی توہین کرانے
کے لیے۔ اگر یہی حال رہا تو میں کالج چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ سر سید نے مجھے پیار محبت سے
سمجھایا اور اپنے ساتھ لے کر ڈائننگ ہال گئے۔ میرے ڈائننگ ہال جانے پر تمام طلبا ر
آگئے۔ سر سید کی موجودگی میں سب نے مل کر کھانا کھایا۔ سر سید نے منشی عبدالکریم کو ملازمت
سے برخواست کر دیا۔ یہ واقعہ تمام طلبا ر میں بے حد مشہور ہو گیا۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ڈائننگ ہال کی دیوار پر جلی حروف میں لکھ دیا ؎

کوئی موتی کے صدقے ہو کوئی ہر لعل کے صدقے
ہم اپنی خشک روٹی پر بگھاری دال کے صدقے

سر سید علیہ الرحمۃ کی اس شعر پر نظر پڑی تو بڑے محظوظ ہوئے اور اسی روز سے
کھانے میں گوشت ضروری کر دیا گیا۔ مگر جنگ بلقان میں ترکی کی امداد کے لیے ہر شخص نے
یہی دال کھا کر گزر بسر کی اور اس طرح ایثار و قربانی کا ثبوت پیش کیا۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں مسٹر ڈبلیو پی ہورسٹ ہیڈ ماسٹر تھے اور سیکنڈ اسسٹنٹ
ماسٹر عبدالباقی صاحب تھے جن کی چڑ شکا تھی کیونکہ پستہ قد اور موٹے تھے۔ ہمارے بورڈنگ
ہاؤس کے ڈاکٹر صاحب کا نام شفاعت اللہ صاحب تھا جن کے ہاتھ میں شفا کم ہونے کی
وجہ سے ان کا نام ہلاکت اللہ رکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں اسٹریچی ہال زیر تعمیر تھا اور بیرا
کی عمارتوں کی دیواریں تھوڑی تھوڑی بنی ہوئی تھیں اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

دوران قیام علی گڑھ میں زیادہ تر کرکٹ فٹ بال اور ٹینس کا کھلاڑی تھا کرکٹ اور
فٹ بال کی سیکنڈ ٹیم کا ممبر تھا۔ ۱۸۹۳ء میں نیشنل والنٹیئر کور قائم ہوا جس کا میں بھی ممبر
تھا اس میں فوجی تربیت دی جاتی تھی محمد علی جوہر، احسان الحق، سجاد حیدر یلدرم، ہمراہ تھا۔

ابوالحسن، محمد متقی خاں اور دیگر حضرات اس کورس میں شامل تھے۔ انہی دنوں ایک آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دسمبر ۱۸۹۳ء میں منعقد ہوئی۔ سر سیدؒ احمد خاں اس کے سیکرٹری تھے۔ دورانِ کانفرنس میں اور احسان الحق سر سیدؒ کے ہمہ وقت اردلی تھے اور ہر وقت اُن کے ساتھ ساتھ ان کے خیمے میں رہا کرتے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے سر سیدؒ کے اس قدر قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔

ہمارے زمانۂ طالب علمی میں طلباء کا لباس ترکی ٹوپی کالی شیروانی اور سفید پاجامہ پتلون نما ہوتا تھا۔ شیروانی کے اوپر بائیں طرف بیج لگانا ضروری تھا۔ بیج میں کھجور کا درخت درمیان میں دائیں طرف تاج اور بائیں طرف ستارہ تھا لیکن اب اس بیج میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ اب تاج کے بجائے کتاب کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

"برابر سنگار کا کمرہ تھا۔ وہاں سے آواز آئی:

"کون ہے؟ رضا علی! یہیں چلا آ۔"

میں نے سنگار کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ کلن خادم، نواب صاحب کو کپڑے پہنا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر ہنس کر فرمانے لگے:

"میں کپڑے پہن رہا ہوں، مگر گھر کے جنگی بہشتی سے کیا پردہ؟""

سر سید رضا علی

میں چودہ جولائی ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ پہنچا اور دوسرے دن کالج میں داخل ہو گیا۔ علی گڑھ میں مجھے وہ وظیفہ ملا جو ہونہار غریب طلبا کو دیا جاتا ہے۔ کالج کی فیس، کمرے کا کرایہ اور کھانے پینے کا سب خرچ ملا کر اور رقم وظیفہ مجرا کر کے مجھے صرف سات روپے ماہوار کالج کو دینے پڑتے تھے۔ رہنے کو کچی بارک کا ستاون نمبر کمرہ ملا اور بی اے پاس کرنے تک میں وہیں رہا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور باقی کالج کی روح کو دعا دی۔ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ میں دولت مند باپ کا بیٹا نہیں ہوں۔

علی گڑھ میں اس طرح رہوں گا جس طرح غریب طالب علم رہتے ہیں مگر کالج کے طور پر لڑکے پڑھا کر اپنا خرچ چلانے کا خیال کبھی دل میں نہ لاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اصرار کیا تھا کہ والدہ صاحبہ اپنی ترکہ پدری کی جائداد فروخت کر دیں تاکہ مجھے خرچ کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا "میرے بچے جائداد کیا چیز ہے۔ میری جان ایمان جو کچھ ہے تیرے لئے ہے جو تیری سمجھ میں آئے کر" چنانچہ وہ جائداد بیچ دی گئی اور بیشتر اسی روپے سے میں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔

میں جب تک مرادآباد کے اسکول میں رہا فٹ بال اور ٹینس کھیلتا رہا، باقاعدہ کھیلنے والوں میں نہ تھا، تاہم اکثر کھیلتا تھا۔ میرے پاس بہت سی یادداشتیں اور روزنامچے موجود ہیں۔ ۹ نومبر ۱۸۹۷ء کی یادداشت جو مرادآباد میں لکھی تھی اس کا ترجمہ یہ ہے: "جس قدر وقت مل سکے پڑھنے لکھنے میں صرف کرنا چاہیے۔ کھیل کے لئے صرف ایک گھنٹہ شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کافی ہے۔" علی گڑھ میں میں نے کسی کھیل سے تعلق نہ رکھا۔

علی گڑھ کے کھلاڑیوں کے بہت سے قصے سنتے تھے۔ ڈر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فٹ بال کا شوق پڑھنے کے ذوق پر غالب آجائے۔ مجھے اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اس مناسبت سے بجائے فٹ بال اور کرکٹ کے میدان کے کالج یونین کو میں نے اپنی طبیعت کی جولانگاہ بنایا۔ ایک روز میں دفتر یونین میں اخبار پڑھنے کے لئے گیا جہاں سب طالب علم خاموشی سے اخبار اور رسالے پڑھ رہے تھے میں بھی ایک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ایک دوست سے جو کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے خاصی بلند آواز میں سب کے سامنے بے تکلفی سے کہا "فلاں صاحب بڑے خرانٹ ہیں آپ نے دیکھا کہ آج کل وہ کس اُدھیڑ بُن میں ہیں" سارے طالب علم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ علمی ادارے کی فضا، ہر شخص خاموشی سے مصروفِ مطالعہ۔ اس حالت میں ایک نووارد کی مخلی بالطبع رائے زنی، جو اصحاب موجود تھے سب نے خیال کیا ہوگا کہ عجب تہی مغز انسان کالج میں آیا ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا اُس وقت مطلق اندازہ نہ ہوا کچھ عرصے کے بعد جب سردار محمد حیات سے راہ و رسم ہوئی تو انہوں نے مذاق میں میری اس جسارت کا تذکرہ کیا۔

میرے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاص قدر تھی لیکن ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبا کا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت افزائی کا خیال نہ اساتذہ کو تھا اور نہ ٹرسٹیوں کو۔ مسٹر بیک کھلم کھلا فرمایا کرتے تھے کہ رنجیت سنگھ (کرکٹ کے مشہور کھلاڑی) دادا بھائی نورو جی (پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی ممبر) سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا سب ہی کھلاڑی تھے۔ ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی صرف روا رکھی جاتی تھی، وہ کسی بھی تحسین و آفرین کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے۔ مولوی عزیز مرزا اور خواجہ غلام الثقلین اپنے اپنے دور کے بہترین علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے طالب علم تھے۔ ان کے ہم عصران دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے، مگر افسوس کہ کالج کے اربابِ حل و عقد کی آنکھوں میں وہ دونوں ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے۔

غلام حسین مرحوم بھی جب تک علی گڑھ میں رہے موردِ عتاب ہی رہے۔ مولانا محمد علی کی جو تھوڑی بہت قدر ان کے طالب علمی کے زمانے میں تھی وہ ان کی ذاتی قابلیت کے باعث نہ تھی بلکہ مولانا شوکت علی کرکٹ کے مشہور کپتان کے بھائی ہونے کی وجہ سے تھی۔ تاہم مسٹر بیک کے بعد مسٹر مارسن (الصدق) سر تھیوڈور مارسین نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے اکثر و بیشتر طلبا کی قدر ان کی علمی قابلیت کے بموجب کی یہ دونوں کا بڑا احسان ہے۔

مسٹر تھیوڈور مارسین اور لیڈی مارسین سے میرے تعلقات ایسے ہوگئے تھے جو اگلے وقتوں میں شفیق معلّم اور عقیدت مند متعلم کے درمیان ہوتے تھے۔ لیڈی مارسین نے چند طلبا کو انگریزی میں ستھرے مذاق کی خطوط نویسی (POLITE LETTER WRITING) سکھانے کے لئے ایک درجہ کھولا۔ سجاد حیدر، ابو محمد، اعجاز علی، محمد ظریف اور میں خطوط نویسی میں لیڈی صاحبہ سے درس لیتے تھے۔ طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہفتے میں ایک دن ہم سب لیڈی صاحبہ کے بنگلے پر جمع ہوتے تھے وہ پہلے سے ہم کو بتا دیتی تھیں کہ کس مضمون پر ہم کو خط لکھنا ہے اور کس کی طرف سے اور کس کے نام لکھنا ہے کاپی میں خط لکھ کر ہم سب تاریخ معینہ سے ایک دو روز پہلے لیڈی صاحبہ کو بھیج دیتے تھے اور وہ بڑی توجہ اور غور سے اصلاح دیتی تھیں اس کے وجوہ خط لکھنے والے کو سمجھاتی تھیں میرے لکھے ہوئے خطوں کی کئی کاپیاں جن میں لیڈی مارسین کے ہاتھ کی اصلاح سرخ پنسل کی لکھی ہوئی ہے۔ اب تک میرے پاس موجود ہیں میرے لکھے ہوئے خطوط پر لیڈی صاحبہ کو اکثر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ ان میں وہ خلق و انکسار موجود نہیں ہے جو شستہ مذاق کے آدمی کی تحریر میں ہونا چاہیئے۔ بد قسمتی سے مجھے اپنی جگہ یہ بدگمانی تھی کہ لیڈی صاحبہ بجائے شستہ اور شائستہ خطوط نویسی کے ہم کو یہ تعلیم دے رہی ہیں کہ ہندوستانی جب انگریز کو خط لکھے تو اسے کیا طرز ادا اختیار کرنی چاہیئے۔ اس بدگمانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ

موصوف کے مزاج کی رفتار شاہانہ واقع ہوئی تھی۔ تھیں وہ پرنسپل کی بیوی مگر چاہتی یہ تھیں کہ طلباء ان کے ساتھ وہی برتاؤ کریں جو اس زمانے کے رئیس، کلکٹر یا مجسٹریٹ ضلع کی بیم کے ساتھ کرتے تھے۔

اسی زمانے میں سر تھیوڈور مارسین نے بھی ایک انجمن بنائی تھی جس کے صرف دو قواعد قابلِ تذکرہ ہیں پہلا قاعدہ یہ تھا کہ انجمن کا کوئی نام نہ تھا۔ دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ انجمن کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہ تھا۔ اس انجمن کے ممبر کم و بیش وہی تھے جو لیڈی مارسین سے شستہ خطوط نویسی سیکھتے تھے۔ انجمن کا اجلاس ہفتے میں ایک مرتبہ شب کے نو بجے منعقد ہوتا تھا انجمن کا ہر ایک ممبر باری باری کسی بحث پر جو سر تھیوڈور مارسین پہلے سے تجویز کر دیتے تھے مضمون لکھتا تھا جلسے میں مضمون پڑھا جاتا تھا اور اس کے بعد اس پر بحث ہوتی تھی۔

لیڈی مارسین کے خطوط نویسی کے درجے اور بے نام کی انجمن کی ممبری سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ سر تھیوڈور مارسین اور لیڈی مارسین آج دنیا میں نہیں رہے، مگر ان دونوں نے مجھ پر جو احسانات کئے ان کا تذکرہ کرنا اور عقیدت کے پھول ان دونوں کی قبروں پر چڑھانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ سر تھیوڈور مارسین اپنے شاگردوں کا خیال عام طور پر اور چہیتے طالب علموں کا خیال خاص طور پر رکھتے تھے۔ اس زمانے میں جو جلیل القدر انگریز انگلستان سے ہندوستان کا دورہ کرنے آتے تھے ان کے دورے میں عام طور پر علی گڑھ بھی شامل ہوتا تھا۔ بسا اوقات وہ سر تھیوڈور مارسین کے مہمان ہوتے تھے اور مارسین صاحب ان سے مجھے ملاتے تھے کبھی کبھی ان کے ساتھ چائے پینے کے لئے بھی بلا لیتے تھے۔ پارلیمنٹ کے کئی ممبروں سے استادِ شفیق نے اپنے گھر پر میری ملاقات کرائی۔

۱۸۹۸ء میں میرے علی گڑھ میں داخل ہونے سے قبل تصنیف و تالیف کا ذوق مولوی شبلی صاحب سے علی گڑھ چھڑا چکا تھا۔ مسٹر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ سے لاہور جا چکے تھے۔ فارسی ہم کو مولوی عباس حسین صاحب پڑھاتے تھے موصوف کی خشک صورت

بلا کی ظرافت کی حامل تھی۔ ضلع جگت کے بڑے شائق تھے۔ درس شروع ہونے سے پہلے اور درس کے بعد خالی وقت میں شاگردوں سے ہمیشہ ضلع بولتے اور دورانِ درس میں بھی اگر موقع ہاتھ آجاتا تو ضلع بولنے سے نہ چوکتے تھے۔ رعایت لفظی اسی طرح کی ہوتی تھی جس کی نوعیت ذیل کے شعر سے معلوم ہوگی ؎

کہ دکی دکھتی ایک دم میں توری
کہ ایسے بے گنوں کو کیا کریلے

مولوی عباس حسین کی حاضر جوابی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ امیر حبیب اللہ خاں والئی کابل ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو کالج کے معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ مخالفوں نے علیگڑھ کالج کی لامذہبی کی داستانیں سنا کر شاہ مرحوم کے کان بھر رکھے تھے۔ اعلیٰ حضرت طلبا کا امتحان خود لینا اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ دینیات کی تعلیم کا کیا حال ہے۔ سب سے پہلے شیعہ طلبا کی ایک جماعت مولوی عباس حسین کی قیادت میں پیش ہوئی۔ اعلیٰ حضرت نے ایک طالب علم سے فرمایا "اسلام کے بنیادی اصول بیان کرو"۔ اس نے جواب دیا اوّل توحید دوسرے عدل تیسرے نبوت چوتھے امامت پانچویں معاد۔ جواب سن کر اعلیٰ حضرت کو تعجب ہوا تو نواب محسن الملک نے بتایا کہ یہ جماعت شیعہ طلبا کی ہے۔ فرمانروائے افغانستان نے فرمایا "سُنّی طلبا کو پیش کرو"۔ مولوی عباس حسین کو اس اشارے سے موقع مل گیا۔ باادب گذارش کی "خدا نے اعلیٰ حضرت کو بادشاہ بنایا ہے "خلق اللہ" کے نزدیک شیعہ سُنّی دونوں یکساں ہیں"۔ مولانا کی حاضر جوابی قابلِ داد تھی، مگر کابل کی بے گیاہ و بے آب پہاڑیوں کے سیرے نے جو جواب دیا وہ حقیقتاً موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ فرمایا "آخوند! مجھے شیعہ سُنّی بلکہ ساری رعایا یکساں عزیز ہے کہ امتحان اس وقت ہی قابلِ اطمینان ہو سکتا ہے جب امتحان لینے والے کی واقفیت امتحان دینے والے سے زیادہ ہو"۔ اعلیٰ حضرت کا لاجواب جواب سن کر مولانا خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد سُنّی طلبا کی باری آئی۔ اعلیٰ حضرت نے

بہ اطمینان دینیات کا امتحان لیا پھر ایک طالب علم کو اپنے قریب بلا کر کہا کہ قرآن مجید میں سے کچھ یاد ہو تو پڑھ کر سناؤ۔ جس کا کلام پڑھ کر سنانے کی فرمائش تھی اُس کے کارخانے دیکھیے وہ طالب علم خوش الحان قاری نکلا۔ اُس نے مصری لہجے میں سورۂ آلِ عمران کا ایک رکوع سنانا شروع کیا اور اعلیٰ حضرت پر رقت طاری ہو گئی اور یہ کیفیت ہوئی کہ رکوع ختم ہونے تک ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر اعلیٰ حضرت اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بار بار جوش سے فرماتے تھے "یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں جھوٹ ہے غلط ہے، افترا ہے، بہتان ہے۔ اب علیگڑھ کی طرف سے معترضوں کی زبان بند کرنے کے لئے سب سے پہلے میں موجود ہوں"

مولوی خلیل احمد صاحب عربی پڑھاتے تھے سنبھل ضلع مرادآباد کے رہنے والے بڑے فاضل اجل تھے۔ تاریخی اور علمی معلومات کا ذخیرہ اس قدر وسیع تھا کہ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ تیسری اور چوتھی ہجری کے بغداد کی گلیوں میں گھوم کر ابھی واپس آئے ہیں۔ عروج کے زمانے میں خلافتِ عباسیہ میں جو ممالک شامل تھے ان کے جغرافیہ کے ماہر تھے، مگر پلپلہ دہن تھے نہ خوش بیانی تھی نہ کلام میں روانی۔ پرانی کتابوں کے عاشق تھے۔ بعض اوقات کھانا کھاتے ہوئے بھی مطالعے میں مصروف رہتے تھے اس لئے کتابوں پر شوربے کے دھبے بھی پڑ جاتے تھے۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ازل میں تقسیمِ حُسن کے وقت حاضر نہ تھے بلکہ اس وقت علم و فضل میں اپنے حصے کی تلاش میں مشغول تھے۔

مولوی عبداللہ صاحب سُنّی دینیات کے ڈین (ناظم) تھے مگر سُنّی شیعہ سب اُن کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ لڑکوں کے دلوں میں جو شبہات دینیات کے درس کے وقت پیدا ہوتے تھے ان کو معلوم کرنے کا موصوف کو کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آتا تھا۔ شبہات رفع کرنا تو بڑی چیز ہے اگر کوئی لڑکا سوال کرتا تو اس اختصار سے اس کا جواب دیتے کہ جیسے چالاک گواہ جرح کے سوال کو ٹالتا ہے، اپنے بیان کا سلسلہ جاری رکھتے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ مولوی صاحب قصداً گریز کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک

جو کچھ جواب میں وُہ ارشاد فرماتے تھے۔ وہ سائل کی تشفی کے لئے کافی تھا۔ اگر پھر بھی سائل کو شک باقی رہ جائے تو اس کا ذمہ دار وہ خود تھا۔

پروفیسر جادو چند چکرورتی ریاضی پڑھاتے تھے۔ شاگرد محبت اور عقیدت سے ان کو بابو صاحب کہتے تھے۔ بابو صاحب نے ایسا مزاج پایا تھا جیسے سوئیٹزرلینڈ کے شہر جنیوا کی مشہور جھیل جس میں سوائے طوفان کے کوئی چیز تموج پیدا نہیں کرسکتی۔ ایف اے کی پہلی جماعت کے طلبار کے ساتھ جن کو مسٹر مارلیسن پیار سے سالِ اوّل کے وحشی کہا کرتے تھے۔ وہ ایسا شریفانہ برتاؤ کرتے تھے گویا ہم میں سے ہر طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد علمی تحقیق و تفتیش کی منازل طے کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایف اے کے طلبار کو منطق پڑھاتے تھے۔ تیار ہو کر آتے تھے۔ اور بڑی جانفشانی سے درس دیتے تھے۔ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کوئی طالب علم منطق میں کمزور نہ رہ جائے۔ ریاضی پڑھانے میں بھی بیگر گہری نظر رکھتے تھے جو مضمون وہ پڑھاتے تھے اس کے نتیجے ہمیشہ بہت اچھے رہتے تھے۔ ایف اے میں میری ریاضی پر ڈاکٹر صاحب نے جو توجہ فرمائی اس کے لئے میں ہمیشہ ان کا ممنون رہونگا۔ سب سے جونیئر پروفیسر زمان مہدی خاں صاحب تھے جو تاریخ پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے انگلستان جانے کے بعد منطق کی تعلیم کا کام بھی اُن کے سپرد کر دیا گیا۔ مسٹر ٹیلنگ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ٹول، مسٹر گارڈنر براؤن اور مسٹر کالن ۱۹۰۱ء میں پروفیسر مقرر ہو کر انگلستان سے آئے تھے۔ مسٹر کالن اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔ بقیہ دونوں صاحبوں نے پروفیسری کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۳ء میں زیادہ تنخواہ ملنے پر مسٹر ٹیلنگ علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے۔ ۱۸۹۹ء میں جب مسٹر بیک کا انتقال ہوا ہے تو مسٹر مارلیسن پروفیسری سے استعفےٰ دے چکے تھے۔ بیک صاحب کے انتقال کے بعد مارلیسن صاحب کو پرنسپلی کا عہدہ پیش کیا گیا جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ ان دونوں صاحبوں میں اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کے انتقال کے بعد بیک صاحب کالج کے تمام انتظامی صیغوں پر چھا گئے تھے۔

مارلیسن صاحب کو اس پالیسی سے اتفاق نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان معاملات میں جو قانوناً سکرٹری یا ٹرسٹیوں کے اختیار میں ہیں پرنسپل کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے۔

دسمبر ۱۹ء کی بات ہے کہ ایک دن میں نواب محسن الملک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی اُس کوٹھی میں رہتے تھے جہاں اب مزمل پیلس کی عالیشان عمارت کھڑی ہے۔ محسن الملک کا دفتر بڑے کمرے میں تھا جس کا دروازہ برآمدے کی طرف تھا۔ میں چق اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ محسن الملک کمرے میں نہ تھے مگر عبدل دفتری موجود تھا۔ میں نے عبدل سے دریافت کیا کیا نواب صاحب باہر تشریف لے گئے ہیں؟ برابر سنگار کا کمرہ تھا۔ وہاں سے آواز آئی کون ہے؟ رضا علی یہیں چلا آ۔ میں نے سنگار کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ کلن خادم نواب صاحب کو کپڑے پہنا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر ہنس کر فرمانے لگے۔ میں کپڑے پہن رہا ہوں۔ مگر گھر کے جنگلی بہشتی سے کیا پردہ ہے؟ میں موصوف کی خدمت میں مسائل حاضرہ نیز مذہبی و اخلاقی مسائل پر بحث میں گستاخانہ آزادی سے اظہارِ خیال کیا کرتا تھا۔ خدا بخشے کیا دل و دماغ پایا تھا۔ دل سے اچھا دماغ اور دماغ سے اچھا دل قسامِ ازل نے ان کو ودیعت فرمایا تھا۔ وہ شاعر نہ تھے مگر بڑھاپے میں بھی اس قدر شوخی تھی کہ ہم نوجوان رشک کرتے تھے۔ اکثر چھیڑتا اور کہا کرتا تھا "آیاتِ بینات" میں نے نہیں پڑھی۔ اگر ایک جلد مرحمت ہو جاتی تو میں بھی اپنے عقائد مذہبی درست کر لیتا۔ "میرا مطلب فوراً تاڑ جاتے تھے مگر بھلا وہ مجھ چھوکرے سے کہاں ہار ماننے والے تھے۔ کبھی جواب دیتے "کالج کے لئے دو لاکھ دلا دے۔ میں خود اس کا جواب لکھ کر تجھے دے دوں گا۔" کبھی فرماتے "ارے کیا پڑھے گا۔ "آیاتِ بینات" میں کیا رکھا ہے اب جس کام کے کرنے کا زمانہ ہے وہ کر۔" جس خوبصورتی سے احسان کرتے تھے اُس کی نظیر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ ۱۹۰۵ء میں محمد متقی نے بی اے پاس کیا۔ وہ میرے خاص دوست ہیں۔ جب میں یونین کا وائس پریزیڈنٹ تھا تو وہ میرے سکرٹری

تھے۔ ایک دن رات کے گیارہ بجے مصطفےٰ حسین رضوی، محمد مثنیٰ اور میں نواب صاحب کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ مئی یا جون کا مہینہ تھا دیکھا کہ باہر صحن میں نواب صاحب پلنگ پر
لیٹے ہیں۔ سامنے چھوٹی میز پر ایک بڑا لیمپ رکھا ہے اور عربی اخبارات پڑھ رہے ہیں۔ ہم
سب کو دیکھ کر فرمانے لگے "کہو کیسے آئے" میں نے عرض کی سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے
ہیں۔ ارشاد فرمایا "رات کے گیارہ بجے کسی بھلے آدمی سے ملنے کا بڑا اچھا وقت ہے۔ سلام
روستائی بے غرض نیست۔ کچھ مطلب ہوگا، کہو کیا بات ہے؟" میں نے جواب دیا "جی تو یہ
ہے کہ غرض لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ مثنیٰ بی اے میں پاس ہو گئے۔ اب ان کے لئے ملازمت کا
کوئی معقول انتظام فرما دیجئے" فرمایا "تم نے کچھ سوچا ہے؟" ہم سب پہلے سے صلاح مشورہ
کر کے گئے تھے۔ میں نے کہا "اگر حضور ایک خط سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر یوپی کو لکھ
دیں تو مثنیٰ کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے" فرمایا "کل خط لکھ کر لے آنا میں دیکھ لوں گا" اس کے
بعد بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن میں خط کا ٹائپ شدہ
مسودہ تیار کر کے لے گیا۔ میں نے مسودہ پڑھ کر سنانا چاہا۔ پوچھا "یہ کیا کاغذ ہے" میں نے
کہا "لاٹ صاحب کے نام اس خط کا مسودہ ہے جس کا رات تذکرہ تھا" ارشاد فرمایا "یہ کون
اہم مسودہ ہے۔ جاؤ کالج کے مہری کاغذ پر ٹائپ کراؤ میں دستخط کر دوں گا" کالج کے
کاغذ پر ٹائپ ہونے کے بعد نواب صاحب نے بغیر پڑھے دستخط کر کے وہ خط میرے
حوالے کر دیا۔ اور چند مہینوں میں محمد مثنیٰ کا تقرر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر ہو گیا۔

محمد ادریس صاحب میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ علی گڑھ میں شروع سے آخر
تک میرا اور محمد ادریس اور نصیر الدین حیدر کا ساتھ رہا۔ عبدالوہاب صاحب امتیاز علی صاحب
انتظار علی صاحب محمد سبطین صاحب محمود حسن خاں صاحب برکت علی صاحب بھی اول سے
آخر تک ہمارے ہم جماعت رہے۔ محمد ادریس بڑے شگفتہ مزاج آدمی تھے ایل ایل بی کرنے
کے بعد وکالت شروع کئے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ خدا غریق رحمت

کرے۔ نصیر الدین حیدر کے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر بنارس کے کوتوال تھے۔ سجاد
حیدر صاحب یلدرم کے بھائی ہیں۔ یلدرم اردو کے نامور انشا پرداز ہیں۔ اُن دنوں ترکی کے
والہ و شیدا تھے۔ ترکی زبان سے بھی کچھ واقفیت پیدا کر لی تھی۔ چند سال مہاراجہ صاحب
محمود آباد کے سیکرٹری رہے۔ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد اب موجودہ مہاراجہ صاحب
محمود آباد کے سیکرٹری ہیں۔ نصیر الدین کا انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبے میں دوسرا نمبر
تھا مگر علی گڑھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی۔ نصیر الدین پر اس کا یہ اثر ہوا کہ پڑھنے
لکھنے میں ڈھیل دی اور پھر کسی امتحان میں کوئی اعزاز حاصل نہ کیا۔ نصیر الدین تھوڑے دنوں
تحصیلدار رہ کر ڈپٹی کلکٹر ہوئے چند سال انکم ٹیکس افسر رہے۔ چار سال ہوئے ڈپٹی کلکٹری سے
پنشن لے لی۔ اب ٹونک میں ممبر مال ہیں۔ اونٹ پر سواری کرنے میں ممکن ہے اُن کو یہ پوچھنے
کا خیال آیا ہو کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ عبدالوہاب محکمہ آبکاری میں
انسپکٹر مقرر ہوئے۔ سولہ سترہ برس ہوئے الہ آباد میں اسسٹنٹ کمشنر تھے اور مجھ سے ملنے
اکثر آتے تھے۔ اب پنشن لے لی ہے۔ دو برس ہوئے علی گڑھ سے مراد آباد واپس جاتے ہوئے
کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ سدا بہار پھول ہیں صورت سے سن و سال کا پتہ
نہیں چلتا۔ عمر کی قید نہ ہوتی تو نہ معلوم ابھی کتنے دنوں اور ملازمت کرتے۔ زمانہ ہوا امتیاز علی
لکھنؤ میں تحصیلدار تھے۔ انتظار علی بنارس میں آبکاری کے انسپکٹر تھے۔ اب پنشن لے لی ہو گی۔
اُن کا لڑکا ہونہار ہے۔ محمد سبطین چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ چودہ گھنٹے پڑھنے والے طالب علموں
میں تھے۔ فارسی کی دستگاہ اچھی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے۔ عرصہ دراز سے پرتاب گڑھ میں وکالت
کرتے ہیں۔ محمود حسن خاں پڑھنے لکھنے میں محمد سبطین کے حریف تھے۔ شام کو بلا ناغہ فٹ بال بھی
کھیلتے تھے۔ بھوپال میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ریاست میں خاصا معقول عہدہ تھا۔ شادی بھی
بھوپال میں کر لی ہے۔ اُن کی بیوی ہز ہائی نس نواب بھوپال کے خاندان کی ہیں۔ برکت علی پنجابی
تھے۔ دراز قامت۔ دُبلے پتلے۔ سانولا گندمی رنگ بڑی بڑی آنکھیں فٹ بال کھیلتے تھے اور

پڑھنے میں دھیان تھا۔ ایک روز محمد ادریس کو شرارت سوجھی۔ برکت علی سے پوچھنے لگے کیوں
بھائی برکت علی پنجابی میں بٹیرو کو کیا کہتے ہیں؟ برکت علی اُردو بولتے تھے مگر میرا خیال ہے ان
مادری زبان پنجابی تھی۔ یہ پوچھنے لگے جی کیا کہا؟ ادریس نے کہا بٹیرو کو پنجابی میں کیا کہتے ہیں؟
منٹ بھر برکت علی کچھ سوچتے رہے پھر بڑے بھولپن سے جواب دیا؛ جی ہمارے پنجاب میں
نہیں ہوتا۔ سب ہنسنے لگے غریب برکت علی کو آخر تک پتہ نہیں چلا کہ ادریس مذاق کر رہے
ہیں۔ شاکر علی صاحب بیرسٹر ہیں اور گورکھپور میں بیرسٹری کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور ادریس
مرحوم سے ایک درجہ اوپر تھے۔ ادریس کے بڑے بھائی محمد ابراہیم صاحب سجاد حیدر کے دوست
تھے۔ جب ادریس علی گڑھ آئے ہیں تو محمد ابراہیم کالج چھوڑ چکے تھے۔ مگر بھائی کا دوست ہونے
کے تعلق سے جب ادریس علی گڑھ میں داخل ہونے کے لئے آئے تو سجاد حیدر کے پاس
ٹھہرے۔ ایک قصہ سناؤں جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور کے علی گڑھ کا کیا رنگ تھا۔ ۱۸۹۸ء
کی بات ہے ادریس ابھی ابھی علی گڑھ پہنچے ہیں سجاد حیدر کے کمرے میں آکر بیٹھے ہیں کچھ اور
طالب علم بھی وہاں موجود ہیں جن میں شاکر علی بھی ہیں۔ شاکر بڑے نٹ کھٹ تھے ادریس سے
پوچھا آپ کا نام؟ ادریس نے جواب دیا محمد ادریس۔ کہنے لگے بجا ہے۔ کوئی دو منٹ تک شاکر
خاموش رہے۔ اس کے بعد ایک چپت غریب ادریس کے سر پر رسید کیا۔ ادریس نے چند
سیکنڈ غور کیا کہ اس تواضع کا جواب زبان سے دیا جائے یا ہاتھ سے۔ پھر سوچا کہ اگر تشدد کا جواب
تشدد سے دیا تو شاکر کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ ان سے یہاں سب لوگ واقف ہیں بدنامی میری
ہوگی کہ آتے ہی مار دھاڑ شروع کر دی۔ زہر کے گھونٹ پی کر ادریس نے بگڑ کر کہا؛ یہ کیا
بدتمیزی ہے۔ مجھ سے آپ سے تو بے تکلفی نہیں ہے!" "ابھی ابھی پہلی ملاقات
ہوئی ہے۔" شاکر نے مسکرا کر کہا؛ "میں کب کہتا ہوں میری تمہاری بے تکلفی ہے۔
اسی لئے تو یہ حرکت کی ہے۔ اب بے تکلفی ہو جائے گی۔" شاکر کا خیال درست
نکلا۔ اس دن سے دونوں بے تکلف دوست ہو گئے۔ بدایوں کے اعزاز عالم صاحب بھی

میرے ہم جماعت تھے خاموش آدمی تھے اور زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے تھے۔
محرم کی مجالس بالائے قلعہ ایک وکیل صاحب کے مکان پر ہوا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم پانچ چھ
طالب علم مجلس میں شرکت کے لئے گئے۔ جگہ بھر چکی تھی۔ اتنی گنجائش نہ تھی کہ سب ایک جگہ
بیٹھتے۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ اعزاز عالم نے اندر کے درجے میں منبر کے سامنے جگہ تاکی
اور ایک صاحب کے ٹھیک آگے اطمینان سے جاکر بیٹھ گئے۔ وہ صاحب خوش مزاج معلوم
ہوتے تھے۔ دریافت کرنے لگے جناب کا دولت خانہ کہاں ہے؟ اعزاز عالم نے پیچھے مڑ کر
جواب دیا؛ بدایوں۔ یہ سُن کر ان صاحب نے اس طرح سر ہلایا گویا وہ اس جواب کے متوقع تھے
طنز آمیز لہجہ میں کہا "بجا ارشاد ہوا کیوں نہ ہو" ولایت علی مرحوم اور نواب علی صاحب غالباً
ایک ساتھ علی گڑھ پہنچے۔ نواب علی خاموش آدمی ہیں؛ بارہ بنکی میں وکالت کرتے ہیں؛ ولایت علی
نے بمبوق کلب قائم کیا اور خود بمبوق کے نام سے شہرت پائی۔ خوش طبعی اور لطیفہ سنجی میں
بمبوق اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ تحریر میں بلا کی شوخی ہوتی تھی۔ کامریڈ میں جو مضمون مرحوم نے
لکھے تھے ان سب کو کشتِ زعفران سمجھنا چاہیئے۔ ناممکن ہے کہ آپ مضمون کی چار سطریں پڑھیں
اور بغیر ختم کئے چھوڑ دیں۔ مثلاً بمبوق کا مضمون پٹواری کے اوپر ہے۔ پٹواری کی شان زندگی
یہ ہے کہ ہر بات اور ہر فعل ذو معنی ہو۔ مضمون میں بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے کہ پٹواری کس
طرح بیک وقت زمیندار کا تابعدار، کاشت کار کا مربی، دیہاتوں کا معتمد، تحصیلدار کے یہاں
کا حاضر باش اور حاکم پرگنہ کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس کے اندراجات
غلط ہوتے ہیں اور وہ سوائے اپنے کسی کا دوست نہیں ہے مگر لطف یہ ہے کہ کوئی کچھ نہیں
کر سکتا۔ بمبوق کے سارے مضامین بڑے پُرلطف ہیں جن میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔
عین عالم شباب میں وہ سفر پیش آیا جو آخر کار سب کو پیش آتا ہے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہائے کیا زمانہ تھا اور کیا صحبتیں تھیں۔

کیا دن مزے کے تھے کہ جو راتوں کو صبح تک
میں تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا

ہماری صحبتوں میں معشوق ہی نہ تھا تو دستِ سوال کہاں سے پھیلاتے مگر فرہاد کو کوہکنی میں اور قیس کو صحرا نوردی میں وہ لطف نہ آیا ہوگا جو ہمیں علی گڑھ میں حاصل تھا اپریل کی چاندنی راتوں میں ہمارا ٹہلتے ہوئے قلعے جانا محمد حیات خاں کا "تیری نرڈ سے طرح داری سے گزری نہ لیا ٹول کی" گانا اور ہم سب کا ترنم کے ساتھ مناجات کے یہ شعر پڑھنا

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی دھوم سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جو سماں بندھتا تھا اس کا لطف کبھی گوہر جان اور نور جہاں کے گانے میں بھی نہ آیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ زندگی بڑے لطف سے کٹی اور کٹتی ہے اور تو اور غالب کا یہ شعر

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

پورے طور پر میرے حال پر صادق نہ آتا ہو لیکن میری زندگی میں اس کی بھی جھلک موجود ہے۔ میں شراب نہیں پیتا مگر یہ کمی اس طرح پوری ہوئی کہ سیاسی زندگی میں اور خاص کر اس زمانے کی سیاسی زندگی میں بجائے خود ہر روز ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جینے کا مزا بھی اس ہی وقت تک ہے جب تک بقول ریاض خیر آبادی انسان کی یہ حالت رہے کہ ع

نہ پیئے اور جھومتا جائے

یہ سب مزے چکھے اور خوب چکھے تاہم علی گڑھ کا لطف علی گڑھ کے ساتھ گیا اور باتوں کو جانے دیجئے۔ تنہا ایک بات کو لیجئے۔ علی گڑھ میں دوستی اور محبت کے اندر کوئی ذاتی غرض

پنہاں نہ تھی علی گڑھ چھوڑنے کے بعد دوست بہت ملے مگر دوستی کا پتہ بہت کم چلا۔ زمانہ کی رفتار کہئے یا ہماری پرانی تہذیب و شائستگی کے زوال کا اثر دوستی اور خود غرضی عموماً مترادف الفاظ ہو گئے ہیں۔ اکثر انگریزی داں اصحاب تو وضع داری کے نام پر ہنستے ہیں مگر یاد رہے کہ وضع داری وہی جنس ہے جس کا نام انگریزی میں کریکٹر ہے۔

"مجھے رخصت کرتے ہوئے اُن (نواب وقار الملک)
کے دہنِ مبارک سے یہ فقرہ نکل گیا:
"تم بھی آخر کار کالج چھوڑ چلے۔"
اس فقرے نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا
میں نے عرض کیا:
"آپ ہی تو مجھے جُدا کر رہے ہیں ورنہ میرا جی
تو یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔"
یہ سُنا تو بہت خُوش ہوئے۔ فرمایا کہ:
"ہم آپ کو تنخواہ تو نہیں دے سکتے لیکن اگر تم آدھی
تنخواہ پر راضی ہو جاؤ تو تمہارا مستقل تقرر یہاں میری مسرت
کا باعث ہوگا۔"
میں فوراً رضامند ہو گیا۔"

پروفیسر عبدالمجید قریشی

یہ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ میں ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء کو علی گڑھ کے مدینۃ العلم میں داخلہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجھے دو قسم کی سواریاں نظر آئیں۔ رتھ، گھوڑا گاڑی یا ٹمٹم سے تو واقف تھا لیکن یکہ پہلے پہل میں نے وہیں دیکھا۔ ریل کے اس پہلے سفر میں جس بزرگ طالب علم کی رہنمائی اور سرپرستی کے سپرد میں کیا گیا تھا، ان کا اسم مبارک عبدالرحیم تھا اور وہ مادرِ علمی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور میرے ہم وطن تھے۔ درسگاہ تک پہنچنے کے لئے ریلوے اسٹیشن سے یکے کی سواری انہوں نے ہی تجویز فرمائی۔ یہ مہمل سواری بہت ہی دل شکن ثابت ہوئی میں منزلِ لیلیٰ کے اس پہلے ہی تجربے سے مایوس تو ہوا لیکن جب اس کی تلاش میں وطن کو خیرباد کہا تھا، اس کی یاد دل میں موجزن تھی تو یکے کے بے پناہ جھٹکوں میں الہیٰ خیر کے بجائے یہ شعر وردِ زبان تھا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

خدا خدا کرکے جب ہم کچی بارک کے مشرقی پھاٹک پر پہنچے جو مارلین کورٹ کے مغرب سے برخلاف کچی بارک کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ یہ غالباً رائڈنگ اسکول کا اصطبل ہے لیکن جب میرے بھائی اور شیخ عبدالغنی ہمارے استقبال کو پھاٹک پر آئے تو میری مایوسی کی انتہا نہ رہی اور میں نے اپنے دل میں کہا: "یا وحشت کیا یہ بارکیں ہم غریب الوطن طلبا کی رہائش کے لئے تعمیر کی گئی ہیں؟" مجھے اس وقت کیا خبر تھی کہ دارالاقامہ کے انہیں بظاہر حقیر کمروں

میں اقامت کرکے بعض سربرآوردہ اولڈ بوائز منصۂ شہود پر آئے اور کچھ آنے والے ہیں۔ اُس وقت مادرِ علمی کی عمارتوں کی کل کائنات بس اتنی ہی تھی کہ کالج کے طلبا کے لئے ایک طرف پکّی بارک جو بعد میں شاندار پختہ عمارتوں کی شکل میں آکر سید محمود کورٹ کہلانے لگی۔ اور دوسری جانب کچی بارک اور کچی بارک تھی جو بعد میں اپنا چولا بدل کر سرسید کورٹ کے نام سے موسوم ہوئیں اور اب یہ کل دارالاقامے مل کر سرسید ہال کہلاتے ہیں کچھ بچوں کے بنگلے بھی اس قطعۂ زمین پر کالج کے طلبا اور اساتذہ کی رہائش کے لئے تھے جس پر اب یونیورسٹی یونین کی شاندار عمارت ہے۔ کالج کی جامع مسجد بن چکی تھی مگر اس کی تکمیل ابھی بہت کچھ باقی تھی۔ پکّی بارک اور کچی بارک کے عین وسط میں شرقاً غرباً اسٹریچی ہال، لٹن لائبریری اور چند پختہ عمارتیں تھیں جو لیکچر روم کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ ایک عمارت میں کالج کے آنریری سیکریٹری کا دفتر تھا۔ پکی بارک کے جنوب مشرق کی جانب ڈائننگ ہال تھا اور شمال مشرقی پہلو میں چند اور پختہ کمرے تھے جن میں پرنسپل کا دفتر تھا اور سائنس اور ریاضی وغیرہ کے لیکچر ہوتے تھے انہی کمروں میں نام نہاد لیبارٹریز بھی تھیں۔ سائنس کی تعلیم ایف ایس سی تک ہوتی تھی۔ مگر آلاتِ سائنس اتنے کم تھے کہ تجربوں کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی تھی۔ بی ایس سی کی تعلیم ابھی جاری نہیں ہوئی تھی۔ مادرِ علمی کی کشش کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے کہ میں نے ایف ایس سی میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے سائنٹفک رجحان کو خیرباد کہنا گوارا کرلیا مگر درس گاہ سے مفارقت گوارا نہ کی۔ اسکول کے طلبا کے لئے دو بورڈنگ ہاؤس تھے ماریسن کورٹ اور ظہور وارڈ۔ نظام میوزیم ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ پرانا کالج ایم اے او کالج اور اسکول عمارتوں کے لحاظ سے بس اتنے ہی تھے۔ جہاں اب ممتاز ہاؤس، آفتاب ہال، منٹو سرکل اور وقار الملک ہال، محسن الملک ہال اور سائنس کی تعلیم کے لئے شاندار تجربہ گاہیں ہیں۔ ان سب مقامات میں ہُو کا عالم تھا اور وہ گیدڑوں کی جولاں گاہ تھے۔

۱۹۰۳ء میں عمارتوں کے اعتبار سے درس گاہ میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ [illegible]

ہونے کا مزا وہاں ضرور تھا۔ نو وارد ہونے اور مادرِ علمی کی اصل روح سے ناآشنا ہونے کی بدولت مجھ پر مایوسی طاری تھی۔ اسی کیفیتِ قلب کے زیرِ اثر میں داخلے کے لئے پرنسپل صاحب کے دفتر میں مجبوراً مسٹر ماریسن صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ میں چونکہ کسی قدر دیر کرکے داخلے کے لئے پہنچا تھا اور بورڈنگ ہاؤس بھر چکے تھے۔ پرنسپل صاحب نے فوری داخلے میں تامل کیا اور مجھے کچھ دن انتظار کرنے کے لئے کہا۔ میں نے اس حکم کو سن کر فرطِ انبساط سے الجھی ہوئی انگریزی میں (ایک انگریز سے بات کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا) اُن سے پوچھا کہ اجازت ہو تو میں پنجاب واپس چلا جاؤں کیونکہ ابھی تو وہاں داخلے ہونے والے ہیں؟ پرنسپل صاحب یہ سن کر ہنس دیئے۔ اور فرمایا ہرگز نہیں ہمارا کام اقامت کی مشکل کو آسان کرنا ہے۔ طلبا کو بھگانا نہیں۔ چند دن اپنے بھائی کے پاس قیام کرو۔

شکر ہے ایک ہفتے کے اندر ہی میرے داخلے کا مسئلہ حل ہوگیا اور میں علی گڑھ برادری میں شامل ہوگیا۔ علی گڑھ کالج ایک اقامتی درس گاہ تھی جہاں اساتذہ اور طلبا ایک بڑے خاندان کی طرح ایک ہی ماحول اور ایک ہی سرزمین پر قیام پذیر تھے۔ جہاں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سوتے جاگتے اساتذہ کی نگاہ طالب علم پر رہتی تھی اور طالب علم کی نظر اساتذہ پر۔ اپنی طرزِ رہائش کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اس خاندان کے ارکان میں اسلامی اخوت کا عملی جذبہ پرورش پائے اور مخصوص روایاتِ خاندانی پیدا ہوں۔ یہ ہے راز اس محبت اور یگانگت کا جو اس مادرِ علمی کے سپوتوں میں پائی جاتی تھی اور جسے دیکھ کر اغیار حیرت اور رشک کرتے تھے۔ دوسری خصوصیت اساتذہ کی شفقت اور ہمہ وقتی توجہ تھی جو طلبا کے دل میں ایک طرف اُن کا رعب اور دوسری طرف اُن کی محبت اور عزت کا جذبہ پیدا کرتی تھی۔

میری طالب علمی کے ابتدائی دور میں کالج کے پرنسپل ماریسن صاحب تھے۔ یہ شفقت اور اخلاق کے پیکر تھے۔ اُن کا حافظہ اتنا قوی تھا اور طلبا میں ان کی دلچسپی اتنی غائر تھی کہ اُن کو قریب قریب ہر طالب علم کا نام یاد رہتا تھا۔ اس زمانے میں ہر طالب علم کے لئے دن میں دو بار

کی حاضری ضروری تھی اور مغرب کی نماز کی حاضری لازمی۔ آخرالذکر کی قید اس لیے لگائی گئی تھی کہ
ہر طالب علم کھیلوں سے، سیر و تفریح سے، خرید و فروخت سے فارغ ہو کر مغرب کی نماز کے
لئے مسجد میں پہنچ جائے۔ پرنسپل صاحب اس معاملے میں خاص توجہ فرماتے تھے مغرب کی نماز سے
ذرا قبل وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کالج میں آمد و رفت کی سڑکوں پر نکل جاتے تھے اور اگر کوئی
طالب علم دیر کر کے لوٹتا ہوا نظر آتا تھا، وہ دور ہی سے اس کا نام لے کر للکارتے تھے۔ یہ
للکار سن کر جہاں فوری ہیبت طاری ہو جاتی تھی وہاں اگلے دن دفتر میں حاضر ہو کر جوابدہی
کا خوف بھی بھوت بن کر سر پر سوار ہو جاتا اور رات کی نیند حرام کر دیتا تھا۔

پرنسپل صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے ایک ہفتہ وار انجمن قائم کر رکھی تھی جس میں چند
اساتذہ اور کچھ سربرآوردہ طلبا شامل ہوتے تھے۔ ہر ہفتے کسی علمی، اخلاقی یا معاشی موضوع پر
کوئی رکن اپنا مقالہ پڑھتا تھا اور اس پر بحث ہوتی تھی۔ اسی میں بعض تنظیمی معاملات بھی سامنے
آجاتے تھے۔ پھر کافی یا چائے کا دور چلتا تھا۔ کالج کی یہ ایک متحرک الآرا انجمن تھی اور اس کی رکنیت
قابل فخر بھی جاتی تھی۔ میں بی اے میں آنے کے بعد اس کا رکن بنا۔ مارٹین صاحب کے بعد جو
پرنسپل آئے انہوں نے بھی اس انجمن کو قائم رکھا۔ آرچ بولڈ صاحب کے جانے کے بعد یہ
انجمن ختم ہو گئی۔ تعلیم کے ابتدائی دور کے اساتذہ میں سے مجھے اپنے محترم استاد پروفیسر چکرورتی
خاص طور پر یاد ہیں۔ عقیدۃً وہ برہمو سماجی تھے، مگر علاوہ وہ ایک سچے خادم علم اور خوگر اخلاق حسنہ
تھے۔ سر سید علیہ الرحمۃ کا انتخاب اساتذہ قابل داد ہے کہ ہمارے تخیل میں بھی کبھی یہ استاد
ایک اجنبی اور غیر مسلم کی شکل میں نہ آیا۔ بنگالی وضع کا سوٹ پہنتے تھے۔ بھاری سی داڑھی تھی۔
سر پر ٹوپی شاذ و نادر ہی پہنتے تھے۔ ریاضی کے ماہر تھے اور اس ادق مضمون کی مشکلات چٹکیوں
میں حل کر دیتے تھے۔ استاذی مولوی ابوالحسن صاحب اور پروفیسر عبدالحق صاحب علی الترتیب
طبعیات اور کیمسٹری کا درس دیتے تھے۔ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ اپنے شاگردوں
کو گھر پر بلاتے تھے اور ان کی دل جوئی کرتے تھے۔ میں بی اے کے آخری سال میں تھا

کہ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب بھی ولایت سے واپس آگئے اور ہمیں درس دینا شروع کیا۔
وہ اپنے علمی تجربوں اور ہمہ گیر قابلیتوں کی بنا پر اپنی ذات میں ایک یونیورسٹی تھے۔ اس دور
کے مذہبی اور اخلاقی علوم کے نامور لوگوں میں مولوی عبداللہ انصاری ناظم سنی دینیات، مولوی
عباس حسین ناظم شیعہ دینیات اور مولوی خلیل احمد استاذ عربی و فارسی تھے جن کے پاس
حاضر ہو کر دل خوش ہوتا تھا اور سکون خاطر نصیب ہوتا تھا۔ شیعہ سنی یا وہابی جھگڑے اس
دور میں کبھی سننے میں نہ آئے تھے۔ نماز سب فرقوں کی ایک ہی مسجد میں ہوتی تھی۔ علیحدہ مسجدیں
بنانے کا کبھی کوئی مسئلہ نہیں اٹھا۔ اللہ اکبر کیا مبارک دور تھا۔ تیسری خصوصیت مادرِ علمی کا
ڈائننگ ہال تھا۔ جہاں بیماری کی حالت کے سوا دونوں وقت کھانے پر حاضری لازمی تھی۔
مدتوں ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانا ایسے اخوت خیز اور تنظیم آموز مواقع فراہم کرتا تھا کہ باید و شاید
ڈائننگ ہال کا انتظام اور باورچی خانے کی دیکھ بھال ایک نگران استاد کے زیر ہدایت
خود طلبا کا ایک گروہ ہی کرتا تھا جو ڈائننگ ہال کے مانیٹر کہلاتے تھے۔ ان میں ایک سینیئر
مانیٹر ہوتا تھا جو تقسیم فرائض کرتا تھا۔ یہ عہدہ ایک ممتاز عہدہ تھا۔ ۱۱ء میں میں سینیئر مانیٹر
تھا۔ کچھ مدت سے یہ شکایت چلی آتی تھی کہ کھانا اچھا نہیں ہوتا اور مقدار بھی کم ہوتی ہے۔ میں نے
اس شکایت کا حل تلاش کرنے کے لئے یہ کیا کہ فی طالب علم جو ہر جنس کی رسد مقرر تھی وہ
سو طالب علموں کے لئے وزن کرائی اور پکانے کے لئے باورچی کے سپرد کی اور اس امر کا اہتمام
کیا گیا کہ باری باری ایک دو مانیٹر برابر باورچیوں کے سر پر سوار رہیں تاکہ رسد میں کمی نہ ہونے
پائے۔ صرف مغرب کی نماز کے وقت ہم لوگ باورچیوں کے پاس سے ہٹے اور وہ بھی کہیں
دور نہیں گئے وہیں قریب ہی نماز پڑھی تھی جب کھانا پک کر تیار ہوا تو کیفیت کے اعتبار
سے تو وہ یقیناً بہتر تھا لیکن کمیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس تجربے کے ناکام ہونے پر
باورچی تو خوش تھے اور ہم انگشت بدنداں۔ کئی دنوں بعد ایک ملازم کو انعام کا لالچ دیا
تو معلوم ہوا کہ جس وقت ہم نماز کے لئے کھڑے ہوئے تھے اس وقت پتیلے کھانے کے

کڑچھے بھر بھر کر باورچیوں نے دیگیں چولہوں میں جھونک دیئے تھے۔ سزا کے طور پر بہت سا عملہ علیحدہ کیا گیا۔ مگر جو نیا عملہ آیا وہ اپنے نئے کمالات ساتھ لایا اور کھانے کی شکایت اکثر رہی۔

چوتھی خصوصیت اس درس گاہ کی طلباء کا سٹوڈنٹس یونین تھا جو طلباء میں خطابت' حاضر جوابی اور تنظیم انتخابات کی صلاحیتیں تخلیق کرتا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی دو ایک اساتذہ کی نگرانی میں طلباءؔ ہی کرتے تھے۔ طلباء کی جو جماعت منتخب ہوتی تھی اس میں وائس پریذیڈنٹ، سیکرٹری اور لائبریرین کے عہدے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ ارکان کی کابینہ بھی ہوتی تھی۔ گو اب ایسی یونین ہر درس گاہ میں قائم ہو گئی ہیں۔ لیکن ان کی ابتدا کا سہرا ہماری مادرِ علمی ہی کے سر ہے اور یہ وقار، متانت اور تنظیم کے ساتھ یہ ادارہ علی گڑھ میں کامیاب رہا۔ ویسی حسن و خوبی اور ضبطِ عمل سالہا سال کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے۔ علی گڑھ میں ہر سکرٹری کی کامیابی کا اندازہ تین چیزوں سے لگایا جاتا تھا۔ اول سکرٹری نے اپنے ایک سال کے عرصہ میں کتنے مقرر پیدا کئے دوم مشاہیر ہند کے مقرروں میں سے کتنے حضرات یونین میں تقریر کرنے آئے اور یونین کے اعزازی رکن بنے۔ سوم کتنے کامیاب مباحثے سال میں ہوئے اور یونین کے بجٹ سیشن میں حزب مخالف کو کیسی ناکامی ہوئی!

اس زمانے ۱۹۰۵ء میں جب کہ تصدق احمد خاں شیروانی (جو بعد میں بیرسٹر اور مشہور کانگرسی) یونین کے نائب صدر اور راقم الحروف معتمد اعزازی تھا۔ کالج یونین کے چند عہدہ داروں نے منتظمانِ کالج سے مشورہ کئے بغیر مسٹر گوکھلے کو یونین میں تشریف لا کر تقریر کرنے کی دعوت دی۔ مسٹر گوکھلے نے بڑی خوشی سے قبول کر لی۔ مسٹر گوکھلے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے بانی اور انڈین نیشنل کانگرس کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اُن کا کالج میں آنا انگریز اساتذہ کو سخت ناگوار گزرا۔ نواب محسن الملک کالج کے سیکرٹری تھے وہ بھی مشکل میں پڑ گئے۔ کیونکہ کالج میں کانگرس کے کسی رکن کا آ کر تقریر کرنا مصلحتِ وقت کے خلاف تھا۔ مجھے اب یاد نہیں آ رہا کہ جلسے کی صدارت مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل نے کی تھی یا نواب محسن الملک نے۔ مسٹر گوکھلے کی تقریر

کا موضوع انگریزی دورِ حکومت میں غیر ملکی تاجروں کا فروغ اور ہندوستانی اقتصادی حالت کی بربادی تھا۔ ان کی تقریر جذباتی کم اور واقعاتی زیادہ تھی۔ تقریر کی عمدہ پذیرائی ہوئی اور تالیوں کی گونج میں تحسین و آفریں سے داد دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج کانگرس نے علی گڑھ فتح کر لیا ہے۔ ان کی تقریر ختم ہوئی تو اب نواب محسن الملک تقریر پر تبصرہ کرنے اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اٹھے۔ تقریر کی ابتدا بہت ہی دھیمی اور کمزور آواز میں کی جس میں بے اطمینانی اور مایوسی کی لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جو حاضرین نواب صاحب کی فصاحت و بلاغت سے واقف تھے وہ سمجھ گئے کہ یہ بھی مرحوم کا ایک اندازِ خطابت ہے۔ موقع اس کا متقاضی تھا کہ وہ غم و افسوس کا پیکر بن کر اٹھیں اور تقریر کے خاتمہ پر فاتحانہ شان سے اپنی کرسی کو سرفراز فرمائیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد آواز میں بلندی اور تقریر کے متن میں ہمہ گیری کی شان پیدا ہو گئی اور وہ پورے خطیبانہ جاہ و جلال کے ساتھ مجمع پر چھا گئے۔ پھر کیا تھا سامعین ان کی دلپذیر شخصیت اور بے پناہ فصاحت سے مبہوت کبھی خنداں تو کبھی گریاں نظر آتے تھے۔ مسٹر گوکھلے نے انگریز کی چابک دستی کا رونا رویا تھا۔ نواب صاحب نے انگریز اور ہندو دونوں کے گٹھ جوڑ سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ پڑھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی بربادی اور ہندوؤں کی دسیسہ کاریوں کے واقعات دہرائے۔ مسٹر گوکھلے کی سحرکاری دور کرنے کے لئے ایسے ہی منتر کی ضرورت تھی۔ منتر کا پڑھنا تھا کہ طلباء ہوش میں آ گئے اور اپنے ضعیف محبِ محسن رہنما کی تقریر سے ان کے چہروں پر مسرت و فخر کی جھلک پیدا ہو گئی۔ پرانی تعلیم، قدیم تہذیب اور مذہبی روایات کے پروردہ یہ قابلِ صد احترام بزرگ علم و عمل اور خلوص کا مکمل نمونہ تھے۔ خدا اُن پر اپنی رحمت اور مغفرت کے پھول برسائے۔ آمین۔ غالباً اسی تقریر کا اثر تھا کہ مسٹر گوکھلے ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار بن گئے اور اگر ۱۹۱۵ء میں اُن کا انتقال نہ ہو گیا ہوتا تو گاندھی جی کی قیادت کامیاب نہ ہوتی۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصے بعد نمائش کے ایام میں ایک طالب علم غلام حسین اور

پولیس میں کچھ جھگڑا ہوگیا۔ یہ غلام حسین بعد ازاں راجہ غلام حسین کے نام سے مشہور ہوئے اور مولانا محمد علی کے مشہور اخبار کامریڈ کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک اہم طالب علم اور بلند پایہ مقرر تھے اور مسٹر گوکھلے کو کالج میں مدعو کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔ پولیس سے تصادم کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہ تھا جو طول پکڑتا، لیکن مسٹر گوکھلے کی آمد اور بعض طلبار کے جن میں راجہ غلام حسین بھی شامل تھے، کانگرسی خیالات انگریز اسٹاف اور انگریز پولیس کپتان کی ناراضی کا سبب بن چکے تھے۔ پولیس کپتان نے معمولی جھگڑے کو سیاسی رنگ میں دیکھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کانگرس کی انگریز دشمنی اب علی گڑھ کالج کے طلبار میں بھی نفوذ کرنے لگی ہے۔ مسٹر آرچ بولڈ اس وقت کالج کے پرنسپل اور مسٹر براؤن دارالاقامہ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ دونوں پولیس کپتان کے ہمنوا ہوگئے اور یہ خبریں آنے لگیں کہ راجہ غلام حسین کو کالج سے خارج کرنے کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ ہر چند کہ طلبار کی ایک کثیر تعداد تھوڑے ہی دنوں پہلے راجہ غلام حسین کو یونین کے انتخابات میں شکست دے چکی تھی لیکن یہ موقع باہمی رقابتوں اور عداوتوں کا نہیں تھا، مادرِ درسگاہ پر چونکہ ایک نئی نوعیت کی آفت نازل ہوتی دکھائی دے رہی تھی، لہٰذا طلبار میں اتحاد اور ہم آہنگی کو استوار کر کے اس آفت کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ بے راہروی سے روکنے کے لئے اُن کی ایک مجلس عمل قائم کی جائے جس کے ارکان کا انتخاب طلبار کی ایک جماعت جلسۂ عام میں خود کرے۔ ارکان مجلس کی تعداد سات ہو، انتخاب کا طریقہ یہ تھا کہ جو طالب علم چاہے وہ کسی طالب علم کا نام پیش کرے اور اگر حاضرین جلسہ میں سے ایک آواز بھی اُس کے خلاف اُٹھے تو اُس طالب علم کو انتخاب سے خارج کر دیا جائے۔ اس کڑے امتحان میں جن سات طالب علموں کو ہر دلعزیزی کے تمغے حاصل ہوئے اُن کے نام یہ ہیں: تصدق احمد خاں شیروانی (۲) عبدالرحمٰن بجنوری (بعدہٗ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری شارح دیوان غالب) (۳) عبدالرحمٰن صدیقی (بعدہٗ مشہور خلافتی لیڈر علی برادران کے رفیق اور سابق گورنر مشرقی پاکستان) (۴) قاضی عبدالعزیز (بعدہٗ قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری مصنف "رحمۃ للعالمین" کے

فرزند جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد لاہور تشریف لا کر "رحمۃ للعالمین" کے انگریزی ترجمہ کا ڈول ڈالا) (۵) سردار محمد اکرم خاں (بعدہٗ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس یوپی۔ تحریک عدم تعاون میں سرکاری ملازمت سے دست بردار ہوئے اور ایک عرصہ تک نواب زادہ لیاقت علی خاں کی جائداد کے منتظم رہے) (۶) عرفان علی (بنگال سے تعلق تھا معلوم نہ ہو سکا کہ زندگی کی دوڑ میں انہیں کیا مقام حاصل ہوا) (۷) راقم الحروف کالج اور یونیورسٹی میں متعدد عہدوں پر فائز رہا۔ آخری عہدہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ ریاضی کا تھا۔

مجلسِ عمل نے جو احکام جاری کئے اُن میں پہلا حکم یہ تھا کہ سوائے کالج سے غیر حاضر رہنے کے اور کوئی بدعنوانی طلبار سے سرزد نہ ہو جس سے اساتذۂ کالج کی بے حرمتی یا قواعدِ دارالاقامہ کی خلاف ورزی ہو۔ یہ سب کچھ اس وقت تک ہوتا رہا جب تک کہ منتظمانِ کالج نے ڈائننگ ہال کو بند کر کے طلبار کو کالج سے نکل جانے کا حکم نہ دے دیا۔ اس سارے عرصے میں جو صرف ایک ہفتے پر محیط رہا، سوائے دو مرتبہ کے کوئی واقعہ ایسا ظہور میں نہ آیا جس میں کالج کے کسی استاد یا ٹرسٹی کی شان میں کوئی گستاخی کی گئی ہو یا مجلس عمل کی کسی ہدایت کی طلبار نے خلاف ورزی کی ہو۔ حکمتِ عملی کی جنگ تھی جو لڑی جا رہی تھی۔ جاسوسی کے دو نظام تھے جو اپنا فریضہ پوری مستعدی سے ادا کر رہے تھے۔ ایک نظام کالج کے اربابِ اقتدار کا تھا جو طلبار کی مجلس عمل کی کارروائیوں کی اطلاع اُن کو پہنچاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فریضہ طلبار ہی میں سے کوئی منافق سرانجام دے سکتا تھا۔ وہ تین طالب علم جو سرکاری ملازمتوں کے امیدوار تھے، اس کام پر مامور تھے اور ہمیں اس کی اطلاع دیر سے ملی۔ تین افراد کی اعلیٰ کمیٹی نے جس کے رکن عبدالرحمٰن صدیقی، عبدالرحمٰن بجنوری اور راقم الحروف تھے باقاعدہ تحقیقات کی ان طلبار کو صفائی کا موقع دیا اور فیصلہ اُن کے خلاف دیا اور اس طرح کارپردازانِ کالج کے نظامِ جاسوسی کو مجروح کر دیا۔ دوسرا نظام جاسوسی طلبار کا تھا جو ٹرسٹیانِ کالج اور اساتذہ کے فیصلوں کی خبریں مجلس عمل کو فراہم کرتا تھا۔ یہ جلسے

نواب محسن الملک کی اقامت گاہ بینی کوٹھی میں ہوا کرتے تھے۔ دو تین مستعد طالب علم جو ہر طرف سے جاسوسی کرتے تھے وہ نواب صاحب کے عزیزوں میں سے تھے اور اُن کا آنا جانا اس کوٹھی میں پہلے ہی سے تھا۔ یہ طلبار ملازمین سے آنکھ بچا کر کوٹھی کی چھت پر چڑھ جاتے تھے اور روشن دانوں میں کان اور آنکھیں لگا کر روزانہ اُن فیصلوں کا لُبِ لباب حاصل کر لیتے تھے اور اُسے مجلس عمل کے سامنے من و عن پیش کر دیتے تھے۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ نہ صرف غلام حسین بلکہ پوری مجلس عمل کے ارکان کو بھی کالج سے خارج کیا جا رہا ہے۔ اتفاق سے جب طلبار جمع تھے تو وہاں ایک نہایت محترم ہستی بھی آنکلے۔ اور موقع مناسب سمجھ کر طلبار کو سمجھانا شروع کیا پوری تقریر نہ حافظے میں محفوظ ہے اور نہ اُس کے اعادہ کی ضرورت ہے۔ جانِ سخن یہ مقطع تھا کہ "مصلحتِ وقت یہی ہے کہ طلبار اپنی شورش کو ترک کر دیں۔ اساتذہ و ٹرسٹی صاحبان کا کسی طالب علم کو کالج سے خارج کرنے کا ارادہ نہیں" حالانکہ وہ صاحب اس جلسے میں شریک تھے جس میں سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔ ادھر اُن کی تقریر ختم ہوئی اور اُدھر بجنوری صاحب مرحوم اٹھے حافظ کا شعر ؎

بفروغِ چہرہ زلفش ہمہ شب زند رہِ دل

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

پڑھا اور بیٹھ گئے جلسہ برخواست ہوگیا اور طلبار کچھ آبدیدہ اور کچھ دل دیدہ اٹھ کر چل دیئے۔ یہ پہلی گستاخی تھی جو سرزد ہوئی۔ دوسرا موقع وہ تھا جب پرنسپل آرکبولڈ صاحب نے مسٹر براؤن کا یہ حکم آکر سنایا کہ ڈائننگ ہال بند کر دیا گیا ہے اور طلبار دارالاقامہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ اس حکم کو سنتے ہی طلبار برافروختہ ہو کر قابو سے باہر ہو گئے اور صرف مسٹر براؤن کے خلاف ہی نعرے نہیں لگائے بلکہ پرنسپل آرکبولڈ صاحب کے خلاف بھی جو سلطان تھے۔

اب جب کہ طعام خانے پر تالے پڑ گئے اور دارالاقامہ شجرِ ممنوعہ قرار پا گیا مجلس عمل نے سوائے بی اے فائنل کے طلبار کے اور اُن طلبار کے جن کے گھر دور تھے باقی سب طلبار کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے گھر چلے جائیں اور جب کالج کھلنے کی خبر ملے واپس آجائیں۔ اب مجلس عمل کے سامنے تین اہم کام تھے:

اوّل الٰہ آباد میں دو تین سو طلبار کی رہائش اور خورد و نوش کا انتظام۔ الٰہ آباد کا انتخاب اس لئے ضروری تھا کہ بی اے کے طلبار کو وہیں امتحانوں میں شرکت کرنا تھی جو ایک آدھ ماہ بعد ہونے والے تھے۔ رہائش کے لئے کچھ مکان کرائے پر لئے گئے اور کچھ طلبار مسلم بورڈنگ ہاؤس میں سما گئے۔

دوم چونکہ بی اے کے طلبار کا بہت سا قیمتی وقت اس شورش میں ضائع ہو چکا تھا اور ہو رہا تھا، لہٰذا امتحانات ملتوی کرانے کی اشد ضرورت تھی الٰہ آباد یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد میں کثرت ہندو ماہرینِ تعلیم کی تھی اُن کو تاثر دینے کے لئے کہ طلبار کانگرس کی ہمنوائی کی بنا پر معتوب ہیں متعدد خطوط ہندو اخبارات میں شائع کرا دیئے گئے جو طلبار کے نام سے نہ تھے۔ ترکیب کامیاب ثابت ہوئی اور امتحانات دو ہفتوں کے لئے ملتوی کر دیئے گئے۔ امتحانات کا یہ التوا الٰہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مثال تھی۔

سوم یو پی کے انگریز گورنر کو اس بات کا یقین دلانا تھا کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ اپنی پرانی روش پر قائم ہے اور موجودہ شورش میں کانگرس کی ہمنوائی کا کوئی شائبہ نہیں اور یہ کہ یہ بے چینی تمام تر علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی غلط فہمی اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ جس کے خلاف کارروائی کی جانی چاہیے۔ یہ مرحلہ اگرچہ سخت تھا مگر اخبار پائنیر میں خطوط کی بھرمار نے یہ میدان بھی مار لیا۔

قصہ مختصر یہ کہ گورنر بہ نفسِ نفیس علی گڑھ تشریف لائے ٹرسٹیوں اور اسٹاف کے متحدہ جلسے کو خطاب کیا۔ تنبیہ کی اور شورش کا خاتمہ کر دیا۔ یہ پہلی کیل تھی جو انگریز اسٹاف کے اقتدار کے کفن میں لگی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد نواب محسن الملک کا انتقال ہو گیا اور نواب وقار الملک نے اُن کی جگہ علی گڑھ کالج کے آنریری سکرٹری کا عہدہ سنبھال لیا۔ یہ دوسری کیل تھی۔

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے مزاج اور طبیعت میں بڑا فرق تھا دونوں سرسید کے فدائی تھے لیکن ان کی مذہبی اصلاحات اور تفسیری تاویلات سے ہم آہنگ نہ تھے۔ اول الذکر بزرگ تو ابتدائے کار میں ان سے تحریری مناظروں میں بھی اُلجھے۔ لیکن بالآخر سرسید کی حُبِ قومی اور خلوصِ نیت سے متاثر ہوئے کہ مذہبی بحثوں کو بالائے طاق رکھ کر اُن کے تعلیمی و اصلاحی عزائم میں اُن کے دستِ راست بن گئے اور سرسید علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد ان کے خلیفۂ اوّل بنے۔

از آستانِ پیرِ مغاں سر چرا کشم
دولت دریں سرائے و کشائش دریں درست

نواب محسن الملک فطرۃً صلح پسند بزرگ تھے اسی حکمتِ عمل پر چلتے رہے۔ انگریز اسٹاف سے نرمی برتنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کالج کے انگریز پرنسپل کو کالج کے نظم و نسق میں اُتنا ہی اقتدار حاصل ہوگیا جتنا ایک انگریز ریذیڈنٹ کو کسی ہندوستانی ریاست میں ہوتا تھا لیکن نواب وقار الملک میں لچک کم اور بالادستی کا جذبہ زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آنریری سیکرٹری کا عہدہ سنبھالتے ہی اختیارات کے مسئلے پر کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ سے اُن کی ٹھن گئی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک زبردست کشمکش کے بعد مسٹر آرچ بولڈ کو پرنسپلی سے استعفےٰ دے کر رخصت ہونا پڑا۔ اس لحاظ سے مسٹر آرچ بولڈ کو آخری ریذیڈنٹ تصور کرنا چاہیئے کیونکہ اُن کے بعد مسٹر ٹول پرنسپل ہوئے جن میں ریذیڈنٹی کی شان کم اور اُستادی کی عظمت زیادہ تھی۔

میں ایم اے کا طالب علم تھا اور سنیئر ہاؤس مانیٹر تھا ایک دن شام کو پانچ بجے کے قریب اپنے کمرے میں دو ایک دوستوں کے ساتھ چائے نوشی کی تیاری کر رہا تھا کہ عابدی آئے ایک ہاتھ میں رکابی میں کچھ نان خطائیاں لئے ہوئے تھے۔ بولے مانیٹر صاحب میں آپ کے لئے یہ تحفہ لایا ہوں قبول فرمایئے۔ میں نے سوچا چوری تو نہیں کی! بولے یہ بھی آپ نے خوب سوال کیا۔ چوری کرتا تو مالِ مسروقہ خود مانیٹر صاحب کو لا کر پیش کرتا ایک دوست کے گھر سے آئی ہیں،

میں آپ کے حصّے کی لے کر آیا ہوں" یہ کہہ کر وہ رکابی میری میز پر رکھ کر چلے گئے۔ ابھی ہم میز پر بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے اور چائے کا پانی پک رہا تھا کہ اجمیر کے رہنے والے ایک طالب علم میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ مانیٹر صاحب میری نان خطائیاں چوری ہوگئی ہیں میں یہ سن کر فوراً اُن کی طرف بڑھا تاکہ مالِ مسروقہ کا وہ حصہ جو میری میز پر رکھا ہوا ہے اُس پر اُن کی نظر نہ پڑے۔ قصہ یہ تھا کہ اُن کے گھر سے نان خطائیاں آئی تھیں جن میں سے وہ اپنے روم فیلو کی نظر بچا کر روزانہ دو چار ناشتے میں کھایا کرتے تھے۔ اس بُخل کو بھلا عابدی کیسے معاف کرتے۔ میں نے اُن صاحب کو تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں ابھی تحقیقات کرتا ہوں، اس کے بعد بورڈنگ ہاؤس گیا عابدی غائب تھے معلوم ہوا کہ ابھی ابھی دو اور طالب علموں کے ہمراہ سائیکلوں پر سوار ہو کر قلعہ کی طرف گئے ہیں۔ میں نے بھی سائیکل سنبھالی اور اُن کا پیچھا کیا۔ حسنِ اتفاق سے یہ صاحبان جلد ہی مجھے مل گئے۔ انہوں نے ابھی چند ہی نان خطائیاں کھائی تھیں کہ میں نے جا لیا۔ ان کی محنت کا معاوضہ تھوڑی سی نان خطائیاں اُن کے پاس چھوڑ کر باقی لے آیا اور اپنی رکابی والی نان خطائیاں اُن میں ملا کر اجمیری صاحب کو پہنچادیں وہ نو وارد تھے۔ اس لئے ان کو ہدایت کی کہ مدرسۃ العلوم میں تنہا خوری حرام ہے۔ آئندہ روم فیلو اور ہمسایوں کا حق ادا کرتے رہنا!

ابھی میری طالب علمی کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ نواب زادہ عبدالمجید خاں ولی عہد ریاست ساونور (دکن) اجمیر چیفس کالج میں اپنی تعلیم مکمل کرکے آئے چونکہ ابھی اُن کی تخت نشینی میں کچھ وقت باقی تھا اس لئے حکومتِ ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ ان کے ہمراہ ایک انگریز اتالیق بھی آیا لیکن انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کی مزید تعلیم و تربیت کے لئے ہم میں سے ایک اور اتالیق کا انتظام کیا جائے۔ پرنسپل صاحب نے یہ فریضہ میرے ذمّے لگایا۔ میں نے پرنسپل صاحب کو لکھ دیا کہ میں نوابوں کی اتالیقی کا اہل نہیں ہوں کیوں کہ اُن کی خودسری اور فرعونیت کی داستانیں زبان زدِ عوام ہیں اور وہ مجھے آپ کی اس نوازش سے مستفید ہونے میں سدِ راہ ہیں۔ انہوں نے میرا جواب نواب زادہ صاحب

کو بھیج دیا۔ ساتھ دن تیسرے پہر جب میں اپنے کمرے کے سامنے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا چند دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا ایک نوجوان اپنے خدمت گار کو ساتھ لئے ہماری طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ ہمارے پاس آکر میرا نام لے کر مجھ ہی سے میرے کمرے کا پتہ دریافت کیا۔ جب ان کو بتایا گیا کہ کمرہ سامنے اور بندہ حاضر ہے تو بولے میں تخلیے میں آپ سے کچھ کہنے آیا ہوں۔ میں اٹھا اور اُن کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچتے ہی بغیر کسی تعارف کے کہا کہ میں نے آپ کا خط دیکھا ہے جو رائے آپ نے ہماری جماعت کے متعلق اپنے خط میں ظاہر کی ہے وہ صحیح ہے یا غلط میں اس پر بحث کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ میں بھی ان معائب سے پاک ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کل سے ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ میری تعلیم کے لئے نکال سکیں گے۔ وقت کا تعین آپ خود کر لیجئے وہی مجھے منظور ہوگا۔ اس حسنِ اتفاق اور شریفانہ اندازِ گفتگو کا میرے پاس اقرار کے سوا اور کیا جواب ہو سکتا تھا۔

اگلے روز سے کام شروع ہو گیا۔ میں جو کچھ پڑھاتا تھا وہ پوری خاموشی سے سنتے۔ جب وقت ختم ہو جاتا تو کہتے کہ میں تھوڑی دیر اور بیٹھوں اور اُن سے باتیں کروں مگر استاد کی طرح نہیں ایک دوست کے مانند۔ جب کام کرتے کچھ روز گزر گئے تو ایک دن بولے کہ آج کھانا ہمیں ہمارے ساتھ کھاؤ۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ کل شام آپ بھی میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہاں یہ بھی خیال ہے کہ میرا کھانا معمولی ڈائننگ ہال کا ہوگا۔ وہ راضی ہو گئے۔ دوسرے دن کھانا ہوا اور خوب ہوا۔ میرے معاوضے کا سوال ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ ایک روز جب نواب زادہ صاحب بھی موجود تھے اُن کے اتالیق نے یہ معاملہ طے کرنا چاہا۔ میں نے عرض کیا کہ معاوضہ کا اب کوئی سوال نہیں کیونکہ ہم دونوں اب دوست بن چکے ہیں۔ اتالیق نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا کہ اس صورت میں تو معاوضہ دگنا کرنا پڑے گا۔ تم پڑھاتے بھی رہو اور دوستی سے بھی ان کو نوازتے رہو۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ دوستی منڈی کا مال نہیں جس کی قیمت چکائی جا سکے۔ دوستی کا بدل نواب زادہ کی محبت ہے اور

درس دینے کا معاوضہ وہ مسرت ہے جو شریف اور سعادت مند شاگرد کو پڑھانے سے مجھے حاصل ہوتی ہے۔ معاوضہ کا معاملہ پھر زیرِ بحث نہ آیا تاہم نواب زادے تھے۔ یہ خیال ان کے دل میں چٹکیاں لیتا رہا۔ ایک دن ایک انگوٹھی جس میں چار چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے تھے دوستانہ تحفے کے طور پر مجھے پیش کی۔ میں نے قبول کر لی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ ان کی ناگواری اور میرے ملال کا باعث بن گئے۔ ہوا یوں کہ انہوں نے استاذی ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی مسند نشینی کے بعد مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ بھی کہ واپسی پر میں اُن کی ریاست میں کسی عہدے پر فائز کیا جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ذکر کیا چونکہ علی گڑھ چھوڑنا مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا اس لئے میں نے اس فیاضی کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ یہ اُن کو ناگوار گزرا۔ بعد ازاں اپنی مسند نشینی کے موقع پر مجھے یاد کیا چونکہ میرا تقرر بحیثیت لیکچرار کالج میں ہو چکا تھا اس لئے فرائضِ منصبی کے ہجوم کی وجہ سے معذرت کرنی پڑی۔ اُن کی شادی ریاست کرولی کی شہزادی سے ہوئی پھر مجھے یاد فرمایا اب بھی جانا ممکن نہ ہوا۔ آخر نواب تھے کب تک ناراضی کو ضبط کے دامن میں چھپائے رہتے۔ چنانچہ خفگی کا اظہار ہوا۔ میں نے انگوٹھی واپس بھیج دی اور تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اُن کی محبت اور شرافت کا اثر میرے دل میں برابر رہا اور اب بھی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کے دورے کے سلسلے میں جب میرا [illegible] جانا ہوا تو مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہ علیل ہیں اور وہیں مقیم ہیں۔ میں مزاج پرسی کے لئے گیا بڑی محبت سے ملے گلے لگ کے روئے اور دل صاف ہو گئے۔ صحت اچھی نہ تھی ریاستیں اور نوابیاں تو اب رخصت ہو گئیں زمانہ بدل گیا خدا کرے جس حال میں ہوں خوش و خرم ہوں۔ بہت یاد آتی ہیں مدرسۃ العلوم کی صحبتیں ؎

اے یادِ زگلشنِ خرم وہ کہ زیستی
شوقِ چمنم ہست و لے بال و پرم نیست

۱۹۰۹ء میں جب کہ میں ابھی ایم اے کا طالب علم تھا ایک روز ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کا حکم ملا کہ پروفیسر چکرورتی رخصت پر جا رہے ہیں اور تم کو کل سے اُن کی جگہ کالج میں جا کر ریاضی کی تعلیم دینی ہوگی جاؤ اور ان سے ٹائم ٹیبل وغیرہ لے لو۔ یہ حکم آنکھوں کے سامنے تھا اور پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ خام تعلیمی حالت میں یہ ذمہ داری اور وہ بھی اپنی ہی درس گاہ میں قبول کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، لیکن اُستاد کے حکم کو کیوں کر ٹالا جاتا، پروفیسر چکرورتی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن سے ٹائم ٹیبل لیا اور جہاں تک وہ ہر درجے میں پڑھا چکے تھے، اُس سے واقفیت حاصل کی۔ ٹائم ٹیبل کا معائنہ کیا، تو پہلی کلاس جس کا سامنا دوسرے دن صبح کرنا تھا، وہ بی اے کے آخری سال کی تھی جس میں بعض نہایت ذہین طباع اور مستعد طلبا شامل تھے۔ یہ طلبا ہوسٹل میں میرے معصر تھے اور میری کوتاہیوں سے آگاہ بھی تھے۔ پھر یہ خیال میری ہمت کو اور پست کئے جا رہا تھا کہ مجھے اپنے استاذِ عالی مقام دریائے علم ریاضی پروفیسر چکرورتی کی مسند سنبھالنا ہے۔ چونکہ اب کوئی راہِ فرار نہیں تھی اور کوئی عذر ڈاکٹر صاحب کے حکم کے خلاف مسموع نہ تھا، اسلئے میں نے ان مشکلات کا جائزہ لینا شروع کیا جن کا مجھے پہلے ہی لیکچر میں سامنا کرنا پڑیگا۔ اس کے بعد میں شام کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنا پہلا لیکچر تیار کرنے بیٹھ گیا اور جس باب سے پروفیسر چکرورتی نے مجھے پڑھانے کی ہدایت کی تھی اُسے اور ایک باب اُس سے پہلے اور ایک باب اُس کے بعد کا مع حوالہ جات اور مشکل سوالات کے اپنے سامنے رکھ لیا۔ آپ یقین فرمایئے کہ میں سات بجے شام سے صبح چار بجے تک اس ایک پینتالیس منٹ کے لیکچر کی تیاری میں لگا رہا۔ جب تیاری حسب دلخواہ ہوگئی تو میں اٹھ کر نہایا اور نماز اور ناشتہ سے فارغ ہو کر کالج کی طرف چل پڑا۔ ابھی کلاس کی حاضری لے رہا تھا کہ پرنسپل مسٹر آرچبولڈ اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کلاس کے پچھلے بنچوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ لیجئے یک نہ شد دو شد۔ ایسے حالات میں میرے حواس خدا کے فضل و کرم ہی سے بجا رہے۔ جب حاضری لے چکا، تو

میں نے کلاس سے پوچھا کہ مجھے اپنا لیکچر کہاں سے شروع کرنا ہے؟ حسب توقع مجھے ایک باب پہلے بتایا گیا۔ اس پر میں نے پورے اطمینان سے کہا کہ پروفیسر چکرورتی صاحب نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ یہ باب ختم کر چکے ہیں لیکن اگر آپ لوگوں کی خواہش ہے کہ میں اسے دوبارہ پڑھاؤں، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ میں نے لیکچر کا آغاز کر دیا۔ الحمد للہ کہ طلبا کے ساتھ پندرہ منٹ کی اس ابتدائی رسہ کشی میں میرا پلہ بھاری رہا۔ اب میں نے کروٹ بدلی اور طلباء سے کہا کہ تمہارے سوالات سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے پہلے تم جتنا پڑھ چکے ہو اُس پر تمہیں پورا عبور حاصل نہیں۔ اب میں چند سوالات تمہارے پچھلے آموختے پر تم سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنے آئندہ کے لیکچروں میں تمہاری کوتاہیوں کا تدارک کر سکوں۔ میرے سوالوں کے جوابات کے لئے تو وہ تیار ہو کر ہی نہ آئے تھے۔ لہٰذا ندامت اور شرمندگی کے سوا کچھ پلے نہ پڑا اور پرنسپل صاحب اور ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے کلاس سے باہر چلے گئے۔

ابھی میں عارضی لیکچرر ہی تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے ڈپٹی کلکٹری کے لئے میرا انتخاب ہوگیا۔ اس زمانے میں صوبائی سول سروس کے لئے مقابلے کے امتحانات نہیں ہوتے تھے بلکہ کالج کے پرنسپل کی سفارش پر ایسی آسامیوں پر تقرر ہوتا تھا۔ ہمارے کالج میں یہ دستور تھا کہ جب کبھی کسی طالب علم کو یہ اعزاز حاصل ہوتا، کالج کے آنریری سیکرٹری اس طالب علم کو چائے یا کھانے پر مدعو کرتے اور کچھ اساتذہ اور چیدہ چیدہ طالب علموں کو بھی اس دعوت میں شریک کرتے۔ پھر چھوٹی سی تقریر میں اُس کو نئی زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتے اور الوداع کہتے۔ ایسی ہی دعوت میرے لئے بھی ہوئی۔ اس وقت آنریری سیکرٹری نواب وقار الملک تھے۔ یہ اپنے اسلامی اخلاق ایثار نفسی اور جرأت و بے باکی کی وجہ سے مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر اور آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے اُن کے دہن مبارک سے یہ فقرہ نکل گیا "تم بھی آخر کار کالج کو چھوڑ چلے"۔ اس فقرے نے میری زندگی

کا رُخ بدل دیا۔ میں نے بلا تامل عرض کیا: "حضور آپ ہی تو مجھے جدا کر رہے ہیں۔ یہ تقرر تو آپ اور پرنسپل صاحب کی سفارش پر ہوا ہے ورنہ میرا جی تو یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔" یہ سنا تو بہت خوش ہوئے فرمایا کہ ہم اتنی تنخواہ تو نہیں دے سکتے، لیکن اگر تم آدھی تنخواہ پر راضی ہو جاؤ تو تمہارا مستقل تقرر یہاں میری مسرت کا باعث ہوگا۔ میں فوراً رضامند ہو گیا اور ایک سو پچیس روپے ماہوار پر انہوں نے میرا تقرر کر دیا۔ نواب صاحب نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں میرے تقرر کا اعلان کرتے ہوئے لکھا کہ "ڈاکٹر ضیاء الدین نے بھی ڈپٹی کلکٹری پر کالج کی کم تنخواہ ملازمت کو ترجیح دی تھی میں دعا کرتا ہوں کہ جیسا ضیاء الدین صاحب کا علمی مستقبل شاندار رہا ویسا ہی عبدالمجید قریشی کا بھی ہو۔"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ باوجود علم کی خامی کے میری علی گڑھ کی زندگی کامیاب رہی اور علی گڑھ کے قیام کی بدولت جو عزت اور مسرت مجھے اپنے ہمعصروں اور شاگردوں میں حاصل رہی ہے۔ اس نے کبھی سرکاری ملازمت کو ترک کرنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آنے دیا۔ الحمد للہ علی احسانہ۔

"وہ سلک ستارے کی کامدار ٹوپی، پرانی کاٹ کی اچکن، مخمل کا پاجامہ، نہایت موٹا جسم چنانچہ لڑکوں کے دربار سے گوشے کی گڑیا کا خطاب عطا ہوا۔ اس خطاب سے ناگواری ضرور ہوئی، مگر لڑکوں کی یہ بے ساختہ پھبتی اپنی جگہ پر ضرور درست تھی۔"

نواب حافظ احمد سعید خاں چھتاری

میں جنوری ۹۰۴ء میں علی گڑھ آیا۔ پنشین وارڈ نامی ایک پھوس کا بنگلہ تھا، وہاں قیام ہوا۔ کھانے کا انتظام ہمارا اپنا تھا۔ مولوی فصیح الدین مرحوم بطور اتالیق ساتھ رہتے اور حافظ عبدالرزاق قرآن سنتے تھے۔ حافظ جی تو کچھ روز بعد چھتاری واپس ہو گئے اس لئے کہ قرآن سنانے کا موقع بہت کم ملتا تھا لیکن مولوی فصیح الدین عرصہ تک رہے۔ مولوی صاحب نہایت مہذب، ذہین اور علم مجلسی سے واقف تھے اور نہایت درجہ خوش نویس تھے۔ اس کے بعد میں میکڈانل بورڈنگ ہاؤس میں چلا گیا، اس کے بعد انگلش ہاؤس میں داخل ہوا اور پولین میں رہنے لگا۔ انگلش ہاؤس میں اُس زمانے میں سر سید مرحوم کی کوٹھی میں تھا۔ کھانے پینے کا انتظام ہر جگہ میرا اپنا ہی رہا۔ بورڈنگ کے مقررہ کھانے سے اکتا کر اکثر بے تکلف دوست میرے ہی یہاں آجاتے تھے اور ساتھ کھانے کا جو لطف مجھے اُس وقت نصیب ہوا وہ مجھ میں ہمیشہ کے لئے راسخ ہو گیا۔ میرا تجربہ ہے کہ بہت سے پیچیدہ معاملے اکثر ساتھ کھانے اور اُٹھنے بیٹھنے سے سہولت سے طے پا جاتے ہیں۔

استادوں میں اُس زمانے کے خاص لوگ علاوہ مسٹر لیس ہیڈ ماسٹر کے میر ولایت حسین، ماسٹر نورالحسن، مسٹر قیام الدین وغیرہ تھے۔ جب میں شروع شروع میں وارد ہوا تو میرا لباس وہی پرانی وضع کا تھا، خاصا سلمہ ستارے کی کامدار ٹوپی، اچکن پرانی کاٹ کی حیدرآبادی سے مختلف، اس پر ریشمی یا مخمل کا پاجامہ پائنچے میں ٹھنسے ہوئے۔ اس لباس میں نہایت موٹا جسم گویا فٹ بال لڑھکتی جا رہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کے دربار سے گڈے کی گڑیا کا خطاب عطا ہوا۔ مجھے اس خطاب سے ناگواری ضرور ہوئی لیکن لڑکوں کی یہ بے ساختہ پھبتی اپنی جگہ پر

ٹھیک تھی، کہیں ہو، گڈے کی گڑیا کی آواز سنائی دیتی۔ یہ حالت تین چار ماہ رہی پھر ہم بھی پرانے ہو گئے، لباس کا طرز بھی بدل گیا اور جو نئے لڑکے آئے انہیں پریشان کرنے میں ہم نے خود حصہ لینا شروع کیا۔ میں انگلش ہاؤس میں ایک صبح بیٹھا ہوا تھا اور میرے اتالیق مولوی فصیح الدین پلنگ پر بیٹھے کلام پاک پڑھ رہے تھے کہ یکایک انہیں ایک دورہ ہوا۔ اس کے بعد سے مرگی کے دورے ہونے لگے، اس لئے مولوی عثمان صاحب اسرائیلی ساکن علی گڑھ کو میرا اتالیق مقرر کیا گیا۔ یہ بہت نیک اور عالم شخص تھے مگر ان میں مولوی فصیح الدین صاحب کی ذہانت نہ تھی۔

اُس زمانے کے ساتھیوں اور دوستوں میں چند کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ سر ارس محمود جماعت میں تو مجھ سے اونچے تھے مگر انگلش ہاؤس میں ہی ان کا زنانہ مکان بھی تھا، اس لئے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ یہ بالعموم سلیپر پہنے نہایت ہی موٹی آواز میں یہ گاتے ہوئے پولین کے پاس سے گزرتے تھے۔

"مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو"

بچپن میں تو کچھ غیر معمولی ذہانت کا پتہ نہ چلتا تھا، مگر جب بڑے ہوئے خوب ترقی کی۔ سر ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی۔ میرے ہم جماعت اور بورڈنگ فیلو سر سکندر حیات مرحوم بھی تھے۔ انہیں کھیلوں کا شوق بالکل نہ تھا۔ اکثر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ ذہین تھے اور انگریزی اچھی تھی۔ مرحوم نے بڑی ترقی کی۔ دو بار پنجاب میں گورنری کا کام کیا۔ مرنے سے پہلے پنجاب کے وزیر اعظم تھے۔ جس روز صبح حیدرآباد میں میں نے اُن کے انتقال کی خبر سُنی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ گویا میرا بھائی مر گیا ہے۔ بے اختیار آنسو نکل آئے۔ سر ناظم الدین بھی انگلش ہاؤس ہی میں رہتے تھے اور ہم جماعت تھے۔ خدا انہیں خوش رکھے بڑے شریف اور مخلص انسان ہیں۔ بنگال میں انہیں بڑا عروج حاصل ہوا۔ گورنر اور وزیر ہوئے اور آج کل مشرقی بنگال کے وزیر اعظم ہیں۔ اس وقت دل کی عجیب حالت ہے۔ بیسیوں دوستوں کی

کی تصاویر سامنے آ رہی ہیں کچھ تو ان میں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے اور کچھ ابھی زندہ ہیں۔ اللہ انہیں خوش و خرم اور باعزت رکھے۔ آمین

میری تعلیمی حالت یہ تھی کہ انگریزی میں سو میں پینتالیس اور پچاس سے زیادہ نمبر کبھی نہیں لئے حساب کے معاملے میں صفر یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین کی ضد۔ جتنی انہیں ریاضی سے نسبت ہے اتنی ہی میرے یہاں اس کی نفی ہے۔ امتحان حساب کا کیونکر پاس ہوتا تھا اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ شاید میرے پرائیویٹ ٹیوٹر زیادہ آسانی سے بتا سکیں۔ مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ایک بار جب امتحان کا زمانہ قریب آیا تو روزانہ کی مشق میں میں نے دیکھا کہ دو سوال ایسے ہیں کہ جو میرے پرائیویٹ ٹیوٹر تیسرے چوتھے دن مجھے نکالنے کو دیتے ہیں۔ جب امتحان کا دن آیا تو میں نے دیکھا کہ پرچے میں وہ دونوں سوال موجود ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کچھ یوں ہی سا سر پڑ آتا تھا۔ البتہ اُردو اور فارسی میں مجھے کلاس میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور بارہا فارسی اور اُردو کے گھنٹے میں میں نے کلاس کو خود پڑھایا ہے۔ آٹھویں کلاس کے ساتھ امتحان میں واجد علی شیدا صاحب ممتحن تھے انہوں نے ۴۹/۵۰ نمبر دیئے اور میری کاپی دوسرے لڑکوں کو دکھانے کے لئے اپنے پاس رکھ لی۔ میں کلاس میں فرسٹ کبھی نہیں آیا۔ البتہ ایک بار ڈبل پروموشن ہوا یعنی ششماہی امتحان ہی میں چھٹی جماعت سے ساتویں میں ترقی مل گئی اور سالانہ امتحان میں ساتویں بھی پاس کر لی۔ لیکن پہلے پانچ لڑکوں میں ہمیشہ آ جاتا تھا۔

مجھے شرارت سوجھتی تو تھی مگر عملی حصہ لینے کی جرأت کبھی نہ ہوئی تھی۔ میں نے کبھی کسی شریک شرارت دوست کی شکایت نہیں کی نہ ان کے خلاف گواہی دی۔ ہاں چھوٹی موٹی شرارتیں خود بھی کرتا تھا۔ مثلاً کاغذ کی گولیاں بنا کر میں اور میرے دوست اپنی جیب میں رکھتے اور ایک تو دینیات کے مولوی صاحب کے گھنٹے میں اور ایک اور ماسٹر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے ان کے گھنٹے میں برابر گولیاں چلتی تھیں۔ اگر استاد کا رُخ میری طرف ہے

تو دوسرے دوست نے گولی چلائی اور اگر رُخ دوسری طرف ہے تو میری جانب سے نشانہ بازی ہوتی۔ ایک بار اس حسن خدمت کے صلے میں پچاس لائن لکھنے کا جرمانہ بھی ہوا۔ ایک یہ شرارت اکثر ہوتی تھی کہ کرسی کی پشت پر چاک سے "اُلّو" لکھ دیا اور جب ماسٹر صاحب نے کمر ٹکائی تو "اُلّو" سیدھا ہوا۔ ایک بار میری کلاس کے لڑکوں نے کچھ چمگادڑیں چھپی ہوئی دیکھیں۔ تجویز یہ ٹھہری کہ انہیں پکڑ کر اس ڈیسک میں بند کر دیا جائے جس میں حاضری کا رجسٹر رہتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دوسرے پیریڈ میں جب ماسٹر صاحب نے حاضری لینے کے لئے رجسٹر نکالنا چاہا تو ایک چمگادڑ تڑپ کر ان کی گود میں جا بیٹھی۔ ماسٹر صاحب کے چہرے کے تغیرات جن میں ڈر، غصہ اور حیرت سب بیک وقت کارفرما تھے میری نظروں میں اب تک محفوظ ہیں۔

ایک اور واقعہ بھی بچپن کی شرارتوں میں قابلِ ذکر ہے۔ ہمارے ہاں ایک ڈرائنگ اسکول ماسٹر تھے ان کے ایک صاحبزادے مصطفےٰ نامی میرے کلاس فیلو تھے۔ ایک روز انہیں یہ سوجھی کہ لنچ کے واسطے وقفہ ہوا تو چاقو لے کر کرسی کے بید کو جس پر بیٹھا جاتا ہے کچھ اس طرح کاٹا کہ بظاہر تو جڑا رہا مگر قریب قریب کٹ چکا تھا۔ ان کی اس جدت طرازی کا علم لنچ سے آتے ہی ہمیں بھی ہو گیا دو ایک اور لڑکوں کو بھی ہو گیا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب تشریف لائے۔ ان کی عادت تھی کہ کتاب ڈیسک پر پٹخ کر زور سے کرسی پر بیٹھتے تھے۔ کرسی کا بید تو پہلے ہی مجروح تھا جوں ہی ماسٹر صاحب بیٹھے گلدستہ بن گئے ہاتھ اور ٹانگیں باہر اور ماسٹر صاحب کرسی کے اندر۔ ادھر ماسٹر صاحب کا اُدھر میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرا ہنسی کے مارے اور ان کا غصے سے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مسٹر ریس بہت ہی اچھے ہیڈ ماسٹر تھے انہوں نے فوراً تحقیقات کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفےٰ پکڑے گئے اور ریس صاحب نے جسمانی سزا دی۔

میرے ہی زمانے میں شہنشاہ جارج پنجم پرنس آف ویلز کی حیثیت سے کالج میں تشریف

لائے، مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے وہ انگلش ہاؤس میں آئے سب لڑکے قطار میں کھڑے
تھے کہ مجھے یکایک چکر آیا اور دھڑام سے گر گیا۔ خیر یہ ہوئی کہ پرنس اس وقت تک نہ آئے تھے۔
خدا جانے یہ کیوں ہوا مگر تھوڑی دیر میں تندرست ہو گیا اور جب پرنس آئے تو اُن کے خیر مقدم
میں شریک ہوا۔ اس موقع پر شہزادے کی تفریح کے واسطے فٹ بال اور ہاکی فیلڈ میں کچھ
کھیل کھیلے گئے تھے۔ وہاں میں بھی موجود تھا۔ سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر تھے میرے
بچانے مجھے لے جا کر ان کے سامنے پیش کیا۔ اُن کی شکل اس وقت تک مجھے یاد ہے۔
بڑے نیک اور رحم دل انسان معلوم ہوتے تھے۔ ہز ہائی نس آغا خاں بھی اسی زمانے میں
تشریف فرما ہوئے۔ یہ اُس وقت بالکل نو عمر تھے۔ شاید تیس بتیس سال کی عمر ہوگی بہت
خوب صورت جوان تھے۔ اُن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو بڑی دلکش اور جاذب
تھی میں نے اسے بہت محسوس کیا۔ اسی موقعے پر مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم نے ہز ہائی نس
کو مخاطب کر کے برمحل یہ شعر پڑھا تھا جس کو سب نے بے حد پسند کیا اور ہز ہائی نس بھی بہت
مسرور ہوئے اور وہ شعر برسوں زبان زد عوام رہا ہے

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

شاہ کابل امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اسی زمانے میں آئے اُن کی آمد کی
بڑی دھوم دھام رہی۔ مجھے کل کی سی بات یاد ہے کہ نواب محسن الملک بہادر آئے اور مجھے اور چند
لڑکوں کو جنہیں مذہبی ذوق تھا پکڑ کر آسمان منزل میں لے گئے معلوم یہ ہوا کہ امیر صاحب
یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ لڑکوں کو اسلامی عقائد اور مسائل پر کیسا عبور حاصل ہے۔ علی الدین صاحب
نے جو ابھی ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائر ہوئے ہیں قرآن شریف پڑھ کر سنایا اور خوب سنایا۔
امیر صاحب مرحوم بہت ہی متاثر معلوم ہوئے۔ پھر مسائل شرعیہ کے متعلق استفسار ہوا تو
قرعۂ فال ہمارے نام نکلا اور بچپن کی "مالابد" کی پڑھائی کام آئی۔ انہوں نے دو سوال کئے۔

ان میں سے یاد رہ گیا ہے اور وہ یہ تھا کہ اگر کوئی بے وضو ہو یا غسل کی ضرورت ہو اور وہ بلا
ارادہ دریا میں گر جائے یا بغیر نیت پاکی غسل یا وضو کرے تو اُس کا غسل یا وضو ہوا یا نہیں؟
جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا کہ بلا نیت کے بھی غسل اور وضو ہو جائے گا۔ امیر صاحب
نے فرمایا کہ اگر کوئی ایسے میں بلا نیت تیمم کرے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؟ اس کا جواب
نفی میں تھا اس واسطے کہ تیمم میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر امیر صاحب نے فرمایا کہ
یہ فرق کیوں ہے؟ یہاں منشی وزیر خاں کی مکتبی پڑھائی کام آئی۔ میں نے جواب دیا کہ پانی طاہر
بھی ہے اور مطہر بھی لیکن خاک فقط طاہر ہے مطہر نہیں اسے حکماً ضرورتاً مطہر بنا دیا ہے اور
اسی واسطے وہ بلا نیت کے پاک نہیں کر سکتی۔ امیر صاحب بہت خوش ہوئے اور باہر نکلنے
کے بعد نواب محسن الملک نے مجھے بہت داد دی اور کہا کہ تم نے ہماری لاج رکھ لی۔

میں نویں جماعت میں تھا کہ سلسلۂ تعلیم ختم ہو گیا۔ مجھے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ
چھتاری میں رہنا ہو گا۔ وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا جب ذرا سوچنا بھی ایک تفریح تھی۔

"علی گڑھ کہنے کو یوپی کے ایک شہر کا نام ہے مگر مسلمانوں میں وہ بغداد و قرطبہ کی یادگار ہے جہاں کے طلبہ حسن عمل سے سرشار اپنی قوم کو دعوت علم و فکر دینے میں مصروف بہ کار، جہاں کے طلبہ انسانی حریت اور مسلم اخوت کے اصولوں کی کھوئی ہوئی نعمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی جہد میں غلطاں اور جہاں کے طلبہ اپنی قوم کی افسردہ مجہول اور مُضمحل ذہنیت کو جو صدیوں کی غیر اسلامی معاشرت کا دل سوز نتیجہ تھی۔ دولت خود اعتمادی اور خودداری سے مالا مال کرنے میں ہمہ وقت ساعی۔"

چودھری خلیق الزماں

میں انٹرنس کے امتحان میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا اور میری والدہ نے یہ طے کیا کہ میں بھی اپنے بھائی جمیل الزماں کی طرح علی گڑھ ہی رہ کر تعلیم حاصل کروں۔ چنانچہ میں اکتوبر ۱۹۰۷ء میں اپنے دو دوستوں حیدر حسین اور مقبول حسین کے ساتھ جنہوں نے اس سال انٹرنس پاس کیا تھا علی گڑھ روانہ ہو گیا جہاں ہم تینوں کو ۵ نمبر کا کمرہ پکی بارک میں جس کو سر سید کورٹ بھی کہتے ہیں رہائش کے لئے مل گیا۔

علی گڑھ کہنے کو یوپی کے ایک شہر کا نام ہے مگر مسلمانوں میں عرف عام میں وہ بغداد و قرطبہ کی یادگار ہے جہاں کے طلبا حُسن عمل سے سرشار اپنی قوم کو دعوت علم و فکر دینے میں مصروف بہ کار جہاں کے طلباء انسانی حریت اور مسلم اخوت کے اصولوں کی کھوئی ہوئی نعمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی جہد میں غلطاں جہاں کے طلبا اپنی قوم کی افسردہ مجہول اور مضمحل ذہنیت کو جو صدیوں کی غیر اسلامی معاشرت کا دلسوز نتیجہ تھی دولت خود اعتمادی و خودداری سے مالا مال کرانے میں ہمہ وقت ساعی، وہ اسلام میں طبقاتی تقسیم کے خلاف۔ فرقہ بندی سے متنفر، وراثت میں غیر اسلامی روایات سے باغی۔ کلچر اور معاشرت میں آفاقی اثرات سے نالاں۔ غرضیکہ وہ اپنے محدود وسائل و ذرائع سے وہ سب کچھ حاصل کرنے کے متمنی جو اُن کی قوم میں نئی رُوح پھونک سکے، تاکہ وہ اپنی گم گشتہ عظمت کو جمہوری دور میں حاصل کر لیں۔ اُن کی کالج کی وردی فراک کوٹ اور ترکی ٹوپی محض کالج کے اندر پہننے کی چیز نہ تھی بلکہ وہ جب اپنے اپنے شہروں کو جاتے تھے تو اسے فخر و مباہات کے ساتھ استعمال کرتے تھے جو ان کے اندرونی جذبات کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس تیس برس کے

عرصے میں جب کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور جب میں ۱۹۰۰ء میں کالج میں داخل ہوا علی گڑھ
کے اثرات نے مسلمانوں کی ذہنیت اس حد تک بدل دی تھی کہ فرقہ پرستی پر اوس پڑ چکی
تھی۔ ناچ اور رنگ کی محفلیں، بٹیر بازی، پتنگ بازی اور عیاشی کی منڈیاں سسک رہی
تھیں اور جو کچھ ان معاشرتی خباثت کا وجود باقی رہ گیا تھا وہ بھی چند روزہ مہمان تھا۔

کالج میں شیعہ سنی ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں نماز پڑھتے تھے۔ مل جل
کر رہتے تھے۔ مذہبی مباحث سے گریز کرتے اور ایک دوسرے کے جذبات کا
احترام کرتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سب کے سب فرشتہ تھے۔ اُن کی خامیاں
اور کمزوریاں اُن کے انفرادی اعمال تھے، مگر ان کی بہت بڑی اکثریت قومی معیارِ
زندگی کو بلند کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ کالج کے بانی سر سید پر کفر و الحاد کے فتوے
مکہ اور بغداد سے منگائے گئے۔ ملک کے اندر اکثر عربی مدارس سے شائع ہونے
والے اخبارات میں اُن کا مذاق اُڑایا گیا، اشعار میں ہجو کی گئی، مگر ان سب کا اثر نہ
بانی کالج پر پڑا اور نہ قوم پر اور کیوں پڑتا جب کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ جب اُن کی سیاسی
عظمت فنا ہوتی رہی، غیر اسلامی شعار رواج پاتے رہے، سیاسی عصبیت ختم ہوتی رہی
اُس وقت صدیوں تک کوئی گونجتی ہوئی آواز قوم کے نام سے نہ اٹھی۔ دور پر دور
بدلے، نئی شہنشاہیاں بنتی رہیں، پرانی نیم جان ہوتی رہیں، شاہی فتاوے ملوکیت کی
عظمت کے صادر ہوتے رہے اور کوئی دار و گیر نہ ہوئی۔ اب اگر نئے دورِ غلامی میں بھی
وہی بے حسی وہی اضمحلال وہی خاموشی خدانخواستہ جاری رہتی تو قوم کا حشر معلوم۔ یہ علی گڑھ والے متدین نہ
تھے صوفی نہ تھے فقیہ بھی نہ تھے مگر قرن کے مسلمان ضرور تھے جس کا سب سے بڑا ثبوت آج یہ ملتا ہے کہ
کوئی سیاسی تحریک مسلمانوں کی ایسی نہ ہوئی جو علی گڑھ کے حامیوں یا کالج ہی کے طلبہ نے نہ اٹھائی ہو۔ ۱۸۷۵ء
سے ۱۹۴۷ء تک صرف بہتر سال ہوتے ہیں، پوری ایک سیاسی تاریخ ہے اور اس کل عرصے میں علی گڑھ کے طلبہ نے ہر صنف

ڈاکٹری، قانون اور انتظامیہ میں اکثریت کے مقابلے میں اپنا سکہ جمائے رکھا اور وہ مملکت
جس کو پاکستان کہتے ہیں، وہ بھی انہی کی دماغی اور عملی کاوشوں کا زندہ جاوید کارنامہ ہے
سر سید کی علمی اور تعلیمی تحریکات سے یوں تو مسلم ہندوستان کی ساری معاشرت اور
سیاست متاثر ہوئی مگر خصوصیت کے ساتھ ان کے افکار اور خیالات سے قریب قریب
تمام تعلیم یافتہ لوگ متفق ہو گئے جن کی صفِ اولین میں ہم نواب محسن الملک، نواب وقار الملک،
سید امیر علی، نواب عماد الملک، مولوی چراغ علی، جسٹس شاہ دین، علامہ اقبال، مولانا شبلی،
مولوی سید علی بلگرامی، سر سالار جنگ، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، سر عبدالقیوم (پشاور)
کو شمار کر سکتے ہیں۔

علی گڑھ کالج کے سند یافتہ طلبا ۱۸۷۵ء سے ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان بھر میں
تمام شعبوں میں پھیل گئے تھے چند مخصوص ہستیوں کو چھوڑ کر بڑے طبقوں میں جو معروف نام سامنے
آتے ہیں وہ عموماً علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہوں یا جج انگریزی عہدہ دار
ہوں یا قومی خدمت گزار، ریاضی دان ہوں یا سائنٹسٹ سب علی گڑھ ہی کے فرزند نظر
آئیں گے۔ پرانی پود میں جسٹس رفیق، مسٹر حسن امام، بیرسٹر مولانا عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں،
سر علی امام، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، خواجہ کمال الدین، خواجہ غلام الثقلین،
سر محمد یعقوب، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، سر وزیر حسن۔ سبھی تو علی گڑھ
کے تھے۔ بعد کے آنے والوں میں غلام حسین، عبدالرحمن بجنوری، عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی
خواجہ ناظم الدین، سر سکندر حیات خاں، نواب زادہ لیاقت علی خاں، ملک غلام محمد، سید شبیہ حسین
ولایت علی بمبوق، سید نواب علی، اورنگ زیب خاں، خواجہ غلام السیدین، خلیفہ شجاع الدین،
نواب فرید جنگ، ڈاکٹر ذاکر حسین، محمد وسیم، ڈپٹی حبیب اللہ خاں، پروفیسر محمد حبیب، مولانا
عبدالماجد دریابادی، نواب حمید اللہ خاں، ڈاکٹر سلیم الزماں، ڈاکٹر سید محمود، خواجہ غلام السیدین
نواب سر احمد سعید خاں چھتاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی وہ چمکتے جاگتے نام ہیں، جن پر

علی گڑھ فخر کرسکتا ہے۔ یہ تو صرف چند نمونے ہیں ورنہ ہزاروں اس قسم کے مڈ کے علی گڑھ نے پیدا کیے جو جیتا نام و نمود سے محروم رہے۔ مگر اپنی زندگی انہوں نے ملت کی خدمت کے لیے وقف کردی۔

تعلیم ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ علی گڑھ نے اس وقت سے قبل جب میں وہاں گیا ہوا کرکٹ کے کھیل میں بڑی شاندار کامیابیاں حاصل کرلی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں بمبئی اور پٹیالہ کی کرکٹ ٹیمیں بہت مشہور تھیں اور عین اُس زمانے میں علی گڑھ نے پٹیالہ کی ٹیم کو جس میں بمبئی کے بہترین کھلاڑی مستری بھی شامل تھے، شکست دے دی تھی۔ لڑکوں کو اُس وقت تک مولانا شوکت کے وہ چھکے ایک نمبر پہاڑی کو پار کر کے کھڈ میں گیند کو پھینکنے اور دوسرے میں نینی تال کی جھیل کی فیلڈ سے اونچی پہاڑی تک ہٹ مارنے کے قصے یاد تھے۔ علی گڑھ کے مشہور کرکٹ کھیلنے والے مولانا شوکت علی، احسان الحق، سرفراز خاں، سعید محمد خاں، عابد علی اور علی رضا تھے بعد میں سیّد حسین مجوند، میجر نذیر علی، اشفاق علی، اسد علی، محبوب عالم اور پرنس حمید اللہ خاں ہوئے۔ بولرز میں ابوالحسن، علی حسن، شفقت اکرم اور سلام نے بہت نام پیدا کیے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ علی گڑھ رفتہ رفتہ کرکٹ کے کھیل میں کیوں پیچھے رہ گیا بہرحال جو جگہ اس نے چھوڑی وہ اپنی ہاکی ٹیم کی بدولت حاصل کرلی۔ میرے زمانے میں اسد علی سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی ہاکی کا کھلاڑی نہ تھا۔ ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک اس بیس سالہ دور میں اسد علی کا کوئی ثانی نہ گزرا بعد میں دھیان چند کا نام ہوا اور بابو اور راجہ بھی ہندوستان کے ہاکی کے مشہور کھلاڑی ہوئے لیکن جس جس زاویے سے اسد علی گول نکالتا تھا وہ کسی نے کر کے نہ دکھایا اسد علی کے علاوہ انور علی فتح محمد خاں گال نورالدین مسعود محبوب عالم غفار، نور اللہ اور پرنس حمید اللہ بڑے جید ہاکی کھیلنے والے تھے پرنس حمید اللہ تو کرکٹ فٹ بال اور ٹینس کے علاوہ اپنے کالج کا نام پولو میں بھی روشن کر رہے

تھے وہ دنیا کے صفِ اوّل کے پولو کھیلنے والوں میں تھے۔

میرے فٹ بال کی خبریں علی گڑھ تک پہنچ چکی تھیں اور کچھ ہی دنوں بعد تصدق احمد خاں شیروانی نے جو اُس زمانے میں فٹ بال کے کپتان تھے مجھے نئے اور پرانے طلبا میں میچ کھیلنے کے لیے دعوت دی۔ مجھے ان کو دیکھ کر خیال آیا کہ وہ فٹ بال کے لیے نہیں بنے ہیں۔ چند ماہ بعد جب تصدق ولایت چلے گئے تو کریم حید رضا لودھی ان کی جگہ کپتان ہوگئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد میں فٹ بال ٹیم کا سیکرٹری ہوگیا۔

میرا کمرہ کھیلوں کی گفتگو کا مرکز بن چکا تھا جس میں سوائے کھیل، شرارت اور مذاق کے کسی اور گفتگو کی گنجائش نہ تھی میرے چند احباب اچھے لڑکوں میں بھی تھے جیسے شعیب ظہیر فاروقی، آفتاب عمر، سیّد لطیف احمد اور اعظم خواجہ، سلام عبدالمجید، عبدالقیوم، مکرم علی وغیرہ ان میں اکثر حیدرآبادی تھے۔ میرے حیدرآبادی دوست قریب قریب سب فٹ بال کھیلنے والے تھے۔

۱۹۱۰ء میں بیگم بھوپال کے تیسرے لڑکے حمید اللہ خاں بھی کالج میں داخل ہوئے۔ اُن کا بنگلہ بورڈنگ ہاؤس سے باہر تھا۔ وہ دو بجے رات تک ہمارے شریک صحبت رہتے تھے مگر اپنی گفتگو یا اپنے اعمال سے کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ ایک شاہی محل کی پروردہ ہستی ہیں بلکہ اپنے آپ کو ہمیشہ منکسر المزاج ثابت کرتے تھے۔ ہماری گفتگو عموماً ہاکی اور کرکٹ یا فٹ بال کے متعلق ہوتی تھی۔

ہم لوگ مختلف قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک پروفیسر کے کمرے کا کل سامان مع بستر جلا دیا گیا کیونکہ اُن کے متعلق شبہ تھا کہ وہ کالج کے اندر شراب پیتے ہیں۔ میرے ساتھ سیّد احتشام علی کاکوروی رہتے تھے جن کے متعلق شک ہوا کہ اُس رات وہ باہر گئے تھے اور اُنہوں نے باغ میں سے جاکر پروفیسر کا بستر جلا دیا۔ علم تو احتشام کو تھا اور وہ اس رات باہر بھی گئے تھے مگر جلانے والے محبوب عالم تھے جو نورالدین کے بعد ہاکی

کے کپتان ہوئے اور ایک دوسرے صاحب محمد احمد تھے میں نے ان کو سمجھایا کہ کمرے کے اندر آگ نہ لگاؤ اگر جلانا ہی ہے تو باہر باغ میں جلاؤ۔ اختتام نے اپنی صفائی پرنسپل ٹول کے سامنے پیش کی جو قبول کرلی گئی اور کسی کو پتہ نہ لگا کہ جلانے والے کون لوگ تھے؟

۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے اٹلی کو طرابلس پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا۔ اٹلی کے اس اقدام کی خبر کا پہنچنی تو لڑکوں کی زندگی میں ایک بھونچال آگیا۔ صدمہ اور جگہ بھی مسلمانوں کو ہوا مگر علی گڑھ کے طلبا میں جو جوش وخروش پیدا ہوا اس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ علی گڑھ کے طلبا روز بعد مغرب مسجد میں اپنے جلسے کرکے انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا برملا اظہار کرنے لگے۔ اس وقت لڑکوں کی قیادت نورالدین ہاکی کیپٹن اور میں خود کرتا تھا جس میں حمید اللہ خاں عبدالوحید خاں کرکٹ کیپٹن اور تمام دوسرے طلبا رہا تے ہمنوا تھے بڑی خوشی یہ تھی کہ اخبار کامریڈ جو مولانا محمد علی نے جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ ہمارے جذبات وخیالات کی بے لاگ تائید کرتا تھا۔ کامریڈ کے پرچے لڑکے بھوکے رہ کر بھی خریدتے تھے اسی زمانے میں اخبار "زمیندار" بھی روزنامہ ہوگیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی دونوں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ادھر علامہ اقبال کی نظم "حضور رسالت مآب میں" کا اثر بھی لڑکوں پر کم نہ تھا۔ دوسرے سال شروع ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" بھی کلکتہ سے جاری ہوگیا اس کی طرز تحریر اور علمی اور معنوی صحافت کے متعلق کچھ کہنا عبث ہے۔ خود مولانا آزاد کی شعلہ بیانی "قال اللہ وقال الرسول" کے پیرائے میں کیا کم تھی جس پر مولانا سید سلیمان ندوی کی "الہلال" کی ادارت میں شرکت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

انہی دنوں مجھے یہ خبر ملی کہ کوئی لڑکا ہمارے مسجد کے جلسوں کی روداد کالج کے اسٹاف کو برابر پہنچا رہا ہے۔ چنانچہ نورالدین کے مشورے سے طے پایا کہ شب کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ عبدالوحید خاں کرکٹ کیپٹن اور یونین کلب کے

پریسیڈنٹ محمد صدیق کو بلایا جائے تاکہ ہم سب اس پر غور کریں کہ ہماری مخبری کون کرتا ہے؟ چنانچہ ایک اونچی میز پر کلام پاک رکھ دیا گیا کہ اس پر ہاتھ رکھ کر اس لڑکے کے متعلق اپنے شک کا اظہار کریں کہ وہ کون ہے چونکہ یہ سب میرے کمرے میں ہو رہا تھا میں نے سب سے پہلے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ میں کسی کو نامزد نہیں کرسکتا۔ اسی طرح نورالدین اور عبدالوحید نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ مگر محمد صدیق نے کہا کہ وہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مخبری عبداللطیف خاں راؤنڈ ٹنگ کیپٹن کیا کرتے ہیں چنانچہ میں نے ایک اشتہار کا مسودہ عبداللطیف خاں کے خلاف تیار کیا جس کو لے کر نورالدین مختلف بورڈنگ ہاؤسوں میں گئے اور وہاں کے لڑکوں سے بائیں ہاتھ سے لکھوا کر چالیس پچاس اشتہار ایک بجے رات کے قریب لے آئے۔ اسی وقت میں اور سید لطف احمد ایک طرف روانہ ہوئے اور دوسری طرف نورالدین اور محبوب عالم میں اور لطف احمد اپنا کام ختم کرکے کمرے میں واپس آگئے مگر جب نورالدین اور محبوب عالم لوٹے تو انہوں نے بتایا کہ کسی لڑکے نے ان کو اشتہار چسپاں کرتے دیکھ لیا ہے دراصل یہ خود عبداللطیف خاں تھے۔ انہوں نے دیا سلائی جلا کر اپنے دروازے کے سامنے اشتہار پڑھا اور اپنے کمرے کے ساتھی آغا مرزا کو جگا کر انہیں بھی اشتہار پڑھوایا اور پھر دونوں نے بورڈنگ بھر میں اشتہار پھاڑنے شروع کر دیئے۔

صبح ڈاکٹر ضیاء الدین نے مجھے میرے کمرے سے بلا بھیجا انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کس کی حرکت ہے میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ خدا معاف کرے میں ایک صریح جھوٹ بولنے کا مرتکب ہوا چونتیس برس بعد جب ایک بار میں ۱۹۴۶ء میں دلی گیا ہوا تھا ڈاکٹر ضیاء الدین سے میری ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ میری ملاقات ان سے اسمبلی ہال میں ہوئی تھی اور شاید گھر پہنچتے پہنچتے وہ دعوت کا قصہ بھول چکے تھے۔ جب میں ان کی جائے قیام پر پہنچا تو وہ گھبرا کر اپنے نوکر کو سرگوشی میں کچھ ہدایات دینے لگے۔ غالباً اس سے قریب کے ہوٹل سے کھانا منگوایا اس درمیان میں میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو

۱۹۱۱ء کے انتشار کا قصہ یاد دلایا انہوں نے فوراً کہا کہ میں جانتا تھا کہ انتشار تم نے لگوایا ہے
مگر میرے پاس ثبوت نہ تھا اس لئے چپ ہوگیا۔ آج ڈاکٹر ضیاء الدین زندہ نہیں ہیں مگر
وہ ایسے گئے کہ اپنے ساتھ علی گڑھ کی فضا اور ماحول کو بھی لیتے گئے علی گڑھ شہر اور یونیورسٹی
اب بھی ہے مگر اُس کی رُوح وہ اپنے ساتھ لے گئے۔

ان دنوں ہم طلباء نے گوشت کھانا ترک کر دیا اور اس طرح جو رقم بچتی وہ ہم ترکی
ہلالِ احمر کو طرابلس کی امداد کے لئے بھیجا کرتے ہمارے اس فیصلے سے کالج کے
یورپین اسٹاف کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے یہ خبر نمک مرچ لگا کر صوبہ کے لیفٹیننٹ
گورنر کو بھیج دی۔ کالج کے ٹرسٹی بھی طلباء کے اس ذہنی انقلاب سے بہت ہراساں ہوئے
کیونکہ ان میں بہت بڑی اکثریت انگریز کے بہی خواہوں کی تھی جو سمجھتے تھے کہ انگریزوں کی
بدگمانی مسلمانوں کے سود و بہبود کے لئے مضر ہے۔

اگست میں نورالدین علی گڑھ سے ہاکی ٹیم لے کر لکھنؤ کی مختلف ٹیموں سے میچ
کھیلنے گئے اور ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ رہ کر وہ واپس علی گڑھ چلے گئے ان کی واپسی کے چند دنوں
بعد اُن کے ماموں زاد بھائی سید حسین کا مجھے ایک خط ملا کہ صرف تین دن کی علالت کے بعد
نورالدین کا انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میرے قلب پر ایک بجلی سی گری اور
آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس عمر میں احباب کی موت بڑی سبق آموز ہوتی ہے۔

کالج کھلنے پر جب علی گڑھ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک رات کو اسٹریچی ہال میں کبوتر
پکڑنے گئے وہاں ناکام رہے تو ٹولی ہوں ایک دوسری عمارت کے اوپر گئے وہاں اندھیرے
میں ان کو کچھ خوف محسوس ہوا لوٹے تو بخار ہوگیا اور اس شدت سے ہذیانی کیفیت طاری
ہوگئی۔ برابر یہ کہتے رہے کہ کھڑکی بند کر دو کبوتر آرہا ہے۔ تین دن اسی کیفیت میں
گزرے اور پھر انتقال کر گئے لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی کبوتر اس عمارت میں جن تھا۔ میں
اُن کی قبر پر جا کر گھنٹوں روتا اور اُن کی مغفرت کی دعائیں کرتا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا

جس قدر اُس زمانے میں اعتقاد تھا پھر بعد میں کبھی نہ ہوا سوائے زبانی اظہار کے وہ دلی
جذبہ قائم نہ رہ سکا۔

اس ذہنی انتشار کی حالت میں خبر ملی کہ بلغاریہ، یونان اور سرویہ نے ترکوں کے خلاف
اعلان جنگ کر دیا ہے یہ ظاہر تھا کہ جنگ بلقان کی پشت پر انگریزوں کا سایہ عاطفت ہے
کیونکہ اس جنگ کا مقصد در پردہ ان کی اٹلی کی حمایت بھی تھی تاکہ انور بے جو اپنے ساتھ
عبدالرحمن عظام اور چند اور مصری مجاہدین کو لے کر راتوں رات مصر سے اونٹوں پر طرابلس
کی سرحد پر پہنچ گئے تھے اور وہاں سے اٹلی کے خلاف مدافعانہ اقدامات کرتے تھے وہ یہ بھی
نہ کر سکیں اور بلقان میں جنگ چھڑنے کے بعد اُن کے چھکے چھوٹ جائیں۔ اس کا ردِ عمل یہ
ہوا کہ علی گڑھ کے طلباء میں انگریزوں کے خلاف غیظ و غضب کی چنگاریاں اور زائد بھڑکیں
اور اُن کے جلسوں میں انگریزوں کو برملا سخت سست کہا جانے لگا۔ ایک دن میں جنگ
بلقان کے متعلق گفتگو کرنے حافظ اسحٰق کے جو ہمارے سینئر مانیٹر تھے کمرے میں گیا۔ وہاں
اُس وقت عبدالرحمن صدیقی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ اسحٰق نے میرا اور اُن کا تعارف کرایا
میں ان کا نام پہلے سن چکا تھا اور یہ معلوم تھا کہ وہ مولانا محمد علی کے اخبار کامریڈ کے منیجر
تھے وہ کالج کے بہت ممتاز طلباء میں تھے اچھے مقرر تھے اور یونین کلب کے پریسیڈنٹ
بھی رہ چکے تھے اُن سے معلوم ہوا کہ وہ کامریڈ سے تعلق ختم کر کے علی گڑھ ایم اے کی
ڈگری لینے کے لئے آئے ہیں۔ اُن سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ ایک طبی وفد ترکی
جانے والا ہے۔ دوسرے دن میں اپنے کمرے کے سامنے لان میں ننگے سر ننگے پاؤں
بال بکھرے ہوئے تقریباً دس بجے چارپائی ٹینس کھیل رہا تھا کہ مجھے رحمن کی آواز سنائی دی
جو میرے کمرے کے سامنے ایک اور صاحب کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں اُسی حالت
میں جا کر اُن سے ملا۔ انہوں نے ڈاکٹر انصاری سے تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا یہ ڈاکٹر
انصاری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں اس غرض سے آیا ہوں کہ کالج کے

کچھ طلباء میرے ساتھ طبی وفد میں ترکی چلیں میں نے بتایا کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اور بہت سے انتظامی معاملات اور نرسنگ وغیرہ میں مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے اُن سے ان کی پیشکش پر غور کرنے کا وعدہ کیا وہ تو چلے گئے۔ اس کے بعد میرا کلاس میں دل نہ لگا۔ دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ میدان جنگ میں ترک سپاہیوں کی خدمت جہاد ہے اور یہاں ہندوستان میں بیٹھ کر رہنا دھرنا عبث اور بے نتیجہ ہے۔ اسی زمانہ میں مولوی ہاشمی فرید آبادی نے ایک دن کالج کی مسجد میں اپنی مشہور نظم "چل بلقان چل" سنا کر بہت رلایا تھا۔

شام کو میرے ماموں زاد بھائی محمد وسیم لکھنؤ سے آئے میں نے اپنی بے چینی کا حال ان سے بیان کیا انہوں نے حوصلہ افزائی کی اور میرے لئے راستہ صاف ہو گیا چنانچہ علی گڑھ سے ہم چھ طلباء یعنی عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی، عبدالعزیز انصاری، منظور محمود، عبدالرحمن پشاوری اور میں شام کی گاڑی سے دلی روانہ ہو گئے۔ میری علی گڑھ سے روانگی کی خبر جب میری والدہ کو پہنچی تو وہ سارے خاندان کو لے کر دلی آ گئیں مجھ سے فرمایا کہ امسال تمہارا بی اے کا امتحان ہے اگر نہ جاؤ تو بہتر ہو گا آگے تمہاری مرضی۔ اس کے بعد پھر کبھی مجھ سے اس قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ اس وقت تک دلی میں رہیں جب تک میں بمبئی کے لئے روانہ نہیں ہو گیا۔

وفد کے لئے چندے کی بھرمار ہو رہی تھی۔ دلی میں سینکڑوں منی آرڈر اور چیک وصول ہوتے تھے۔ جوش و خروش کا یہ عالم دیکھ کر لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے وفد کو باریابی کا موقع دیا اور چلتے وقت تمام ممبران وفد سے ہاتھ ملا کر اُن کو رخصت کیا۔ انگریز کی سیاسی چال خدا نے کسی دوسری مغربی قوم کو شاید نہیں بخشی ایک طرف وہ بلقان کی جنگ کو ہوا دیتا ہے دوسری طرف مسلمانوں کے طبی وفد کو خیر باد کہتا ہے۔

ہم لوگ اکتوبر کے آخری ہفتے میں بمبئی روانہ ہوئے ریلوے اسٹیشن پر اتنا ہجوم تھا کہ ہمیں اپنے ریل تک جانا مشکل ہو گیا مولانا محمد علی نے سب کو پیار کر کے ڈبڈبائی آنکھوں سے رخصت کیا۔ بمبئی پہنچ کر ہم دو چار دن وہاں ٹھہرے اور اس کے بعد استنبول روانہ ہو گئے۔

کالج کھلنے کے بعد شروع اکتوبر ۱۹۱۳ء میں ترکی سے علی گڑھ واپس آ گیا میں ایک دوست کے کمرے میں مقیم ہوا اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو درخواست دی کہ میرا کمرہ جو وفد کی روانگی سے پہلے میرے پاس تھا، مجھے دیا جائے کئی روز تک میری درخواست کا جواب نہ ملا۔ ایک روز انہوں نے مجھے عبدالرحمن صدیقی اور شعیب قریشی کو کھانے پر بلایا اور ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ایک زمانہ میں وہ بھی انگریز کے خلاف تھے مگر بعد ازاں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بغیر انگریزوں کی اعانت کے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اُن کی گفتگو بہت غور سے سنی۔ مگر جو تاثرات ہم ترکی سے لے کر لوٹے تھے وہ ایسے نہ تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس گفتگو سے زائل ہو جائیں۔ تاہم میں یہ ضرور سمجھا کہ اب مجھے کمرہ ملنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی مگر میرا یہ خیال غلط نکلا آخر ایک دن تنگ آ کر نواب محمد اسحٰق خاں صاحب سے جو اُن دنوں کالج کے سیکرٹری تھے اصلاحِ احوال کی گزارش کی انہوں نے فوراً ڈاکٹر صاحب کو ہدایت کی کہ خلیق کو کمرہ دے دیا جائے۔ یہاں میرے پرانے ساتھی محمد احتشام علی کاکوروی بھی مقیم تھے۔ احتشام کا بی اے پر اس سال چوتھا حملہ ہونے والا تھا، مگر اس کی تیاری کی انہیں کوئی فکر نہ تھی اچھا طالب علم تو میں کبھی نہیں رہا مگر اس سال میں بی اے کی تیاری کے لئے دل سے خواہشمند تھا۔ مشکل یہ تھی کہ احتشام کے خاص برانڈ "احتشام سگریٹ" پینے کے لئے جو میکڈو پولو فرم لاہور سے پندرہ ٹن ہر ماہ بن کر آ جاتے تھے۔ طلباء کا ہمارے کمرے میں مجمع لگا رہتا تھا۔ احتشام کی اپنی جائداد بھی تھی اور ان کی بیوی کی بھی خاصی جائداد تھی جس کو وہ بڑی بے دردی سے صرف کرتے تھے کالج کے پرنسپل کے لئے برابر تحفے تحائف خصوصاً تیتر اور بٹیریں وقتاً فوقتاً بھیجا کرتے تھے دو ایک مہینے تو ایسا ہوتا رہا کہ جب نو دس بجے طلباء اپنے کمروں میں چلے گئے تو ہم دونوں کتابیں لے کر لیٹے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد انہوں نے کہا کہ یار اب نیند آ رہی ہے کل سے دیر تک پڑھا کریں گے اتنا کہہ کر لیمپ گل کر دیتے تھے۔ سونے سے قبل ایک مصرعہ ضرور پڑھتے تھے ؎

قصۂ غم میہ باز آغاز کرد

اور اس کے بعد کچھ دیر اپنی دلچسپیوں کی داستان سنایا کرتے تھے۔ بہر صورت وہ اسی سال بی اے میں کامیاب ہو گئے اور میں بھی پاس ہو گیا۔

•• حیدرآباد دکن میں مرحوم (سر سید) راس مسعود کئی زمانہ ناظم تعلیمات رہے مگر ایسی محبوب اور مؤثر شخصیت کہ پتھر موم ہو جائے۔ بہت رسوخ اور مقبولیت حاصل تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام میں بہت ہاتھ رہا۔ ہمدردی، سیر چشمی اور فیض رسانی طبیعتِ ثانی تھی۔ بہت سے نہال ہو گئے جیسے سردار صورت تھے ویسے ہی سردار سیرت تھے۔ تعجب کیا کہ ایک سید

تھے محمود کے بیٹے سر سید کے پوتے

خاندانی شرافت سے

مالا مال ••

پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس برنی

جب ہم علی گڑھ کالج پہنچے، تو لڑکوں نے ہماری وضع قطع اور خیالات و اعتقادات سے یہ اندازہ لگایا کہ ایک مذہبی دیوانہ آگھسا ہے۔ خوب لطف رہے گا۔ مگر اللہ کا فضل اور اللہ کا شکر کہ اُس نے عزت و وقار کے ساتھ ہوشیاروں میں بسر کرا دی۔ طالب علمی کے دائرے میں انعام، تمغے اور اعزازی عہدے سب کچھ دلائے، حتیٰ کہ سب سے اعلیٰ امتیاز، کالج یونین کی صدارت بھی عطا کی۔ ڈیپوٹیشنوں میں مدراس، میسور اور مشرقی بنگال دُور دُور تک پہنچے، چندہ جمع کیا۔ پھر جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے موقعے پر کالج کے طلبا میں ہمدردی کی تحریک پھیلی۔ پورے ایثار کے ساتھ اپنی ضروریات، حتیٰ کہ خورد و نوش مختصر اور سادہ کر کے کئی سال بچت سے ہزار ہا روپیہ بہ غرض امدادِ ترکی بھجوا دیا۔ تقریباً پچاس ہزار تک میزان پہنچی۔ اس معرکے میں بھی مالی انتظام بہ حیثیت معتمد من جانب طلبا ہمارے ہی سپرد رہا اور الحمدللہ کہ حساب میں ایک پائی کا فرق نہ آیا۔ ان سرگرمیوں میں سرکار دربار تک شکایت پہنچی۔ انقلابیت کا الزام لگا۔ نگرانی رہی، مگر سانچ کو آنچ کیا! نیت پاک تھی آخر کو بات صاف ہو گئی۔

۱۹۱۲ء میں جب بی اے کا امتحان پاس کیا تو مسلم یونیورسٹی کی تحریک خوب زوروں پر تھی۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہی اعزازی مددگار کی حیثیت سے نواب وقار الملک علیہ الرحمۃ کے ساتھ یونیورسٹی کے کام میں لگ گئے۔ جہاں کہیں تحریک کی مخالفت ہو یا چندہ وصول ہونے میں رکاوٹ ہو یا کاغذوں میں گھٹ پٹ ہو، جا پہنچنا اور جو کچھ بن پڑے کرنا۔ اس سلسلے میں نواب صاحب نے جو اہم کام تفویض فرمائے بفضلہ وہ خوبی سے انجام

پائے۔ اچھے اچھوں کو تعجب اور بعض کو حسد نہیں تو رشک ضرور ہوا۔ یوں بھی نواب صاحب خصوصیت سے عنایت و اعتماد فرماتے تھے۔ کالج میں جو تربیت ملی، نواب صاحب کی توجہات نے اُسے تانبے سے سونا بنا دیا۔ نواب صاحب کی صحبت اسلامی اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ سادگی، بے نفسی، فرض شناسی، عزم و استقامت، ہیبتِ حق اور نصرتِ حق کی عجب شان نظر آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ علی گڑھ کالج واقعی مسلمانوں کی تعلیم گاہ ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بھی کالج میں بڑی شخصیت تھے اور آج مسلم یونیورسٹی میں بھی خاص شخصیت ہیں۔ ریاضی کی قابلیت تو مسلم ٹھہری، مگر ہم فنون (آرٹس) کے طالب علم تھے، ان کے شاگرد نہ تھے، تاہم ڈاکٹر صاحب کی توجہات سے بہت مستفید ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی عنایت و شفقت اور دعوت و ضیافت صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے۔ دل کھول کر طالب علموں سے ملنا، ان کو بلانا، کھلانا پلانا، سیر و شکار کو ساتھ لے جانا اور ہر طرح ان کی مدد کرنا۔

اس کارِ خیر میں ڈاکٹر صاحب کی برابری کرنا بہت دشوار تھا۔ ان کا بنگلہ بہت سے طالب علموں کو حاتم طائی کا دربار معلوم ہوتا تھا۔ کوئی ایسا ہی مخالف یا مٹیا پھوس کرنگھوس طالب علم ڈاکٹر صاحب کی ہل چل سے الگ رہے تو دوسری بات تھی۔ ہم نے بھی ڈاکٹر صاحب کی فیاضی سے بہت فیض حاصل کیا، لیکن اس خصوصیت کا نتیجہ سلبِ آزادی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کالج لائف میں سب سے زیادہ دخیل تھے۔ طالب علموں کے تعلیمی مقاصد اور معاشرتی معاملات پر اصولی اختلاف کی بنا پر اُن سے بارہا چلی اور کبھی کبھی تو خوب چلی، مگر کیا مجال کہ دل میں فرق آئے۔ اختلاف مخالفت بن جائے، نہ ہمارے ادب میں کمی نہ ڈاکٹر صاحب کی شفقت میں کمی۔ نیک نیتی سے بحث چلی جس کی بات چلنی تھی چل گئی۔ طبیعت کو سکون ہوا، وہی ہم رہے ڈاکٹر صاحب۔

غرض کھٹا میٹھا سا تعلق تھا۔ اس میں عجب لذت تھی، البتہ بعض طالب علموں سے جو تلخی تک نوبت پہنچی، دُور دُور تک کش مکش پھیلی، اس کو کیا کہئے! بہرحال تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ فی الجملہ ڈاکٹر صاحب طلبا کو بہت عزیز رکھتے تھے اور خود بہت ہردلعزیز تھے۔

سر سید راس مسعود صاحب سے بھی علی گڑھ کی دوستی تھی، جب تعلیم سے فارغ ہو کر مرحوم ولایت سے علی گڑھ تشریف لائے، تو ہماری تعلیم کا آخری زمانہ تھا۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا کام چل رہا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ ہم اعزازی پرنسپل اسسٹنٹ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔ دن دن بھر اُن کے بنگلے پر رہتے۔ ڈاکٹر صاحب خوب کس کر کام لیتے اور خوب دل کھول کر کھلاتے پلاتے۔ گرمی کا موسم تھا کھانے کی کے پروا، برف، لیمونیڈ، آئس کریم، پپیا، خربوزہ، آم سب موجود۔ خوب کھاؤ پیو، مگر کام کا حق ادا کرو۔ صاحب خدمت زیادتی بدلتی رہتی تھی۔

جس زمانے میں ہم نواب وقار الملک بہادر کے اعزازی مددگار تھے خورد و نوش کی یہ بہار بھی کہاں! اگر صحبت ایسی نعمت تھی کہ اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال شام کو فرصت ہوتی تو راس مسعود صاحب تشریف لاتے۔ ڈاکٹر صاحب سے بہت خصوصیت تھی، سید صاحب سے ہماری بھی ملاقات ہوئی، دوستی ہوئی اور تعلقات میں اتنی ترقی ہوئی کہ جب علی گڑھ میں مرحوم کی شاندار طریقے سے شادی کی رسم ادا ہوئی ہندوستان کے گوشے گوشے سے معزز مہمان آئے اور علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے جمع ہوئے، تو اس قابل یادگار تقریب کے ہم مہتمم بنے۔ گو بڑے بڑے قدیم دوست اُن کے موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے بڑی محبت سے سینے سے لگایا اور کہا کہ تو مجھے حقیقی بھائی کے برابر ہے، شادی کا اہتمام تو اپنے ذمے لے تو مجھے اطمینان اور خوشی نصیب ہو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لینا دینا، نقدی، زیور، بری، جہیز کل اہتمام اپنے ہاتھ میں رہا اور اللہ تعالے نے حسن انجام سے سرخرو فرمایا۔

اس شادی کی مصروفیت میں ایک ہفتہ ایسا گزرا کہ نہ دن کی خبر تھی نہ رات کا ہوش، مگر خوشی کا جوش تھا کہ نہ گرانی نہ تکان، جب موقع ملا کھا لیا، جب وقت ملا سو لیے، ہر دم تازہ دم۔ عجب تقریب تھی جو شریک ہوئے آج تک یاد کرتے ہیں۔ بہرحال علی گڑھ میں ہماری محبت پختہ ہو چکی تھی۔

اگست ۱۹۱۷ء میں مرحوم کا تار پہنچا کہ جس قدر جلد ممکن ہو چلے آؤ۔ دار الترجمہ میں تمہارا سخت انتظار ہے۔ ہم علی گڑھ کالج میں کام کر رہے تھے، پرنسپل صاحب کو عذر ہوا۔ ہفتے عشرے تار دوڑتے رہے، خط چلتے رہے۔ آخر کار ہم چل دیئے اور آکر شریک ہو گئے۔

حیدرآباد دکن میں مرحوم کل زمانہ ناظم تعلیمات رہے، مگر ایسی محبوب اور موثر شخصیت کہ پتھر موم ہو جائے۔ بہت رسوخ اور مقبولیت حاصل تھی، انہی کی بدولت بڑے بڑے کام نکلتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام میں بھی بہت ہاتھ رہا۔ ہمدردی، سیر چشمی اور فیض رسانی طبیعت ثانی تھی۔ بہت سے نہال ہو گئے۔ جیسے سردار صورت تھے ویسے ہی سردار سیرت تھے اور تعجب کیا تھا۔ سید تھے محمود کے بیٹے، سر سید کے پوتے، خاندانی شرافت سے مالا مال، آخر میں نواب مسعود جنگ بہادر اور سر کے خطابات ملے۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

کالج میں کھیلوں کا معیار ہمیشہ سے بلند رہا، باقاعدہ ٹیم میں جگہ پانا کچھ آسان بات نہ تھی۔ تاہم کپتان مہربان تھے، دوست تھے، سامان مل جاتا تھا اور ہم نے جو ٹیم اناڑیوں کے نام سے بنا رکھی تھی وہ دل کے حوصلے نکال لیتی تھی۔ کھیلوں کے ساتھ ایک رائڈنگ اسکول بھی تھا جہاں گھڑ سواری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کا خاص چندہ مقرر تھا۔ دس بارہ گھوڑے تھے اور ایک دفعدار، جو سواری سکھلاتے تھے۔ ہم رائڈنگ اسکول میں بڑے شوق سے شریک ہوئے حتیٰ کہ سواری کا امتحان پاس کر کے باقاعدہ سند حاصل کی۔ سواری میں خوب

گرے اور گرے بغیر سواری نہیں آتی، خوف نہیں نکلتا۔ ایک آدھ مرتبہ تو جان پر آبنی، خدا
کا فضل تھا حادثے سے محفوظ رہے۔ حضرت والد صاحب کی ہدایت تھی کہ بغیر وضو گھوڑے
پر سوار نہ ہونا، سوار ہوتے ہی ایک آیت شریفہ پڑھنے کی بھی تاکید تھی، حضرت یہ دونوں
معمول مسنون فرماتے تھے۔

ہمارے زمانے میں سوئمنگ باتھ نہ تھا، بعد کو تیار ہوا۔ اس لئے تیراکی باقاعدہ نہ
سیکھ سکے۔ کبھی کبھی خربوزوں کی فصل میں احباب کی پارٹی ہردوا گنج جاتی تو نہر کے کنارے
پانی میں ڈبکی لگا لیتے، نہا لیتے کہ گویا ہم بھی تیراک ہیں۔ البتہ حیدرآباد (دکن) پہنچ کر تیرنا
سیکھا۔ بڑا کمال نہ سہی پھر بھی ڈوبنا آسان نہ رہا۔ سیکھنے کے دوران میں کئی مرتبہ ڈوبتے
ڈوبتے بچے، ایک مرتبہ تو بلا مبالغہ ڈوب ہی گئے تھے، زندگی تھی نکل آئے۔

تیراکی کا حال بھی سواری کا سا ہے۔ ڈوبے بغیر تیراک پختہ نہیں ہوتا۔ کالج میں سائیکل
چلا لیتے تھے، حیدرآباد (دکن) میں موٹر سے سابقہ پڑا۔ شوفر کا محتاج ہونا گوارا نہ ہوا، چلانا
سیکھا۔ کئی مرتبہ جان لینے، جان دینے کی نوبت آئی، لیکن بال بال بچ گئے۔

ہندوستان میں معاش کی جو حالت ہے ظاہر ہے اکثر نوجوانوں کو تعلیم کے بعد ملازمت کا
مرحلہ پیش آتا ہے، آج کل تو معمولی ملازمتوں پر بھی سخت کشمکش رہتی ہے۔ ہمارے کالج
کے زمانے میں پروونشل سروس خاص کر ڈپٹی کلکٹری بڑی چیز تھی؛ چنانچہ اکثر ہونہار
نوجوانوں کو اس کے خواب نظر آتے تھے، اُس کے پیچھے گھوڑے دوڑاتے تھے، اُس کے
بعد منصفی تھی، مگر اس میں حکومت کی وہ کشش نہ تھی۔ بہرحال اللہ چاہے تو چھپر پھاڑ کر
دے، ہمارے پیر تلے بھی بٹیر آگئی۔ بی اے میں جو ہماری کامیابی صوبے میں اعلیٰ رہی، تو
حسب قاعدہ ہم بلا درخواست منجانب یونیورسٹی ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہونے کے مستحق
ہو گئے، چنانچہ شملہ سے پرنسپل صاحب مسٹر ڈول کا خط پہنچا کہ تم نامزدگی کے مستحق ہو، ڈپٹی
کلکٹری پر آمادہ ہو تو مطلع کرو۔ آخر پرنسپل صاحب اپنے استاد بھی تھے، طبیعت سے

واقف تھے، خود ہی یہ بھی لکھ دیا کہ چاہو تو تعلیم جاری رکھو، چاہو ملازمت شروع کر دو۔
جو صورت پسند ہو اختیار کر و، مجھے کسی صورت میں اصرار نہیں۔

اشارہ ظاہر تھا کہ تعلیم بہتر ہے، خود ہماری بھی یہی خواہش تھی؛ البتہ والدین کی رضا
لازمی تھی، لیکن وہاں بھی حوصلے کی کمی نہ تھی۔ جب ہم کو مذبذب دیکھا تو بہ خوشی اجازت
دے دی کہ ملازمت سے شکریے کے ساتھ عذر کر کے تعلیم جاری رکھو! چنانچہ یہی کیا گیا۔
یہ عذر کالج میں ایسا غیر معمولی سمجھا گیا کہ کالج میگزین میں اس کا ذکر آیا، ادھر احباب و
اقربا نے شور مچایا کہ ایسی ملازمت سے انکار کفرانِ نعمت ہے۔ کوتاہ اندیشی ہے! مغرور
ہے۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن ہم خوش ہمارے والدین خوش تو خدا خوش!

"مہمان خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ میری خاطر مدارات کے لیے اہتمام ہو رہے ہیں جیسے کوئی شہزادہ کسی شہزادے سے ملنے آرہا ہے۔ اُس وقت فطرت بھی اپنی ساری حسین رعنائیوں کے ساتھ اس منظر کو دلفریب بنانے میں مصروف نظر آتی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، شاداب سبزہ، کھلے ہوئے پھول، مہمان خانہ اُس وقت اندر کا اکھاڑہ نظر آتا تھا اور ہر طرف سے ایک ہی جملے کی گونج سنائی دے رہی تھی،

میاں کے مہمان،

میاں کے مہمان"

خان بہادر حکیم احمد شجاع ساحر

میں ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج کی فرسٹ ایر کلاس میں داخل ہوا اور خوبیٔ قسمت سے مجھے سرسید کورٹ میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ اللہ اللہ یہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا! ابھی آپ نے چراغ کو بجھنے سے پہلے دیکھا ہے، وہ لَو بھی دیکھی ہے جو خاموش ہونے سے پہلے شمع کے قلب و جگر سے اٹھتی ہے! بس یوں سمجھئے کہ علی گڑھ میں اس وقت مسلمانوں کے اقتدار کے چراغ کی یہ آخری بھڑک تھی اور اسلامی تہذیب کی شمع کی آخری چمک۔ سرسیدؒ کے بعد نواب محسن الملکؒ اور جسٹس سید محمود اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے اور علی گڑھ کی خانِ سیادت اسلامی عظمت کے اس آخری سرمایہ دار کے ہاتھ میں تھی جو وقار الملکؒ کے لقب سے آج تک مشہور ہے اور جس کی خودداری، جمعیت عزم، حق پرستی اور شریعت اسلامی کی پابندی، ہندوستان میں اسلام کا آخری وقار اور ملت اسلامیہ کا آخری اعتبار تھی

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر ایٹ لا جن کی صورت اور سیرت کی خوبیاں دل فریب اور علی گڑھ کے لئے جن کا ایثار ہماری قومی روایات کا طغرائے امتیاز ہے۔

بھیکم پور، چھتاری، دتاولی، پہاسو اور طالب نگر کے معزز خاندانوں کے وہ تمام نامور افراد جن کی ذاتی سخاوتوں اور خاندانی فیاضیوں کا احسان علی گڑھ کالج کی گردن پر ہے اور رہے گا۔

مسٹر آرچ بولڈ، علی گڑھ کالج کے پرنسپل جن سے نواب وقار الملک کا اصولی اختلاف اکبر الٰہ آبادی کے اس مشہور شعر کا محرک ہوا ہے

ہز ہائی نس نواب سر محمد حمید اللہ خاں آخری فرمانروائے بھوپال۔ نواب سر احمد سعید خاں جو چھتاری یوپی کے گورنر ہوئے اور پھر حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم بھی رہے اور سر سکندر حیات خاں اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں اپنی نامور والدہ کے ایما کے مطابق جو اُس وقت فرمانروائے بھوپال تھیں، اس سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے کہ کبھی کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلا کہ وہ ایک عظیم الشان ریاست کے ولی عہد اور اس کے آئندہ تاجدار ہیں۔ مجھے ان کے ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سردار سکندر حیات خاں تو ۱۹۰۸ء ہی میں انگلستان چلے گئے تھے اور صاحبزادہ احمد سعید خاں بھی قریب قریب اسی زمانے میں اپنی ریاست کے امور کے انصرام میں منہمک ہو گئے تھے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں کی تعلیم اور جسمانی تربیت کا قوام کچھ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ جہاں وہ لکھائی پڑھائی میں بہت ہوشیار تھے وہاں ہر قسم کے کھیل کود میں بھی بڑے چاق و چوبند تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بلا تامل و تکلف قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ ساتھ ہی وہ علی گڑھ کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی مقرر ہو گئے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں اتنے خوش خلق اور ملنسار تھے کہ سب انہیں اپنا دوست سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ سب کے دوست تھے۔ مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے میں ونسنٹ سمتھ کی "تاریخ ہند قدیم" پڑھ رہا تھا اور سانچی توپ کا تذکرہ میرے زیرِ مطالعہ تھا کہ صاحبزادہ صاحب اس طرف آ نکلے۔ فرمانے لگے "کیا پڑھ رہے ہو؟" میں نے سانچی توپ کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ "تم سانچی توپ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی کیوں نہ لو۔"

میں نے کہا: "سانچی توپ ہے کہاں؟"

مسکرا کے فرمایا: "اپنی ریاست میں۔"

میں نے کہا: "ضرور حاضر ہوں گا۔"

ارشاد ہوا: "تو وعدہ ہے بھول نہ جانا!"

یہ بات ۱۹۱۱ء کی ہے میں ۱۹۲۲ء میں بمبئی سے واپس آ رہا تھا جب بھوپال کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو بھوپال کا نام سنتے ہی میرا ذہن زمانہ ماضی کی کئی منزلیں طے کر گیا اور مجھے اپنا وعدہ یاد آیا جو میں نے اس مملکت کے آئندہ تاجدار سے کیا تھا۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست اور پشاور کے رئیس آغا محمد وسیم جان میرے رفیقِ سفر تھے۔ اُن سے بھوپال اترنے کے لئے کہا، انہوں نے وجہ دریافت کی میں نے کہا "پھر عرض کروں گا۔" عابد میرا پرانا ملازم میرے ساتھ تھا۔ اُس سے اسباب اتارنے کے لئے کہہ دیا۔ اس وقت رات کے کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ گرمی کے موسم میں بارش ہو رہی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس قریب ہی موجود ہے۔ ہم دونوں رفیق سفر اور عابد بارش میں بھیگتے بھاگتے ریسٹ ہاؤس کی طرف چلے۔ یہ ریسٹ ہاؤس اسٹیشن سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ گھپ اندھیری رات اس پر بارش اور پھر ہماری ناواقفیت، غرض بڑی مشکل سے ریسٹ ہاؤس پہنچے، بیرے کو بلایا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں گرمی برآمدے میں لوچھاڑ اس پر قیامت یہ تھی کہ پلنگ کے گدیلے میں کھٹملوں کی بھرمار۔ کبھی اندر کبھی باہر، غرض جوں توں کر کے رات کاٹی۔ صبح ہوتے ہی میں نے صاحبزادہ ولی عہد بہادر کو اپنی حاضری کی اطلاع پہنچانے کی غرض سے ایک عریضہ لکھا اور اُسے بیرے کے حوالے کر دیا۔

کچھ یونہی سا ناشتہ کر کے میں اور وسیم جان سو گئے۔ ناگہاں آنکھ کھلی، باہر ایک شور سنائی دیا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے بدن پر صرف ایک بنیان تھا اور میں پنجابی طرز کا تہمد باندھے ہوئے تھا۔ باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف سرکاری پیادے اور سپاہی دوڑ رہے ہیں۔ سامنے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ

کالج کے در پہ لکھ دے کوئی آب گر سے

ختم ہو نہ سکے سیکرٹری آرن بولڈ سے

مولوی عبدالباقی کالج کے برسر، پروفیسر ابوالحسن جو اس زمانے میں نواب وقار الملک بہادر کے سیکرٹری تھے، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ریاضیات کے پروفیسر، ڈاکٹر ہارووتس، عربی زبان کے جرمن پروفیسر، مولانا عباس حسین السنۂ شرقیہ کے اُستاد، پروفیسر ڈیوڈ آکٹرلونی، سید محمود کورٹ کے اور پروفیسر تھیوڈر براؤن سرسید کورٹ کے پرووسٹ، مولانا سلیمان اشرف معلم دینیات، پروفیسر ریٹل اور پروفیسر پریوس، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر عبدالمجید، میر ولایت حسین، ماسٹر قاسم حسین اور ماسٹر جلال الدین غرض کس کس کے نام گنوائے جائیں! اُس وقت یہ آسمانِ علم وفضل روشن ستاروں سے بھرپور تھا اور درخشاں نجوم وکواکب سے معمور۔

مسٹر محمد علی (گس) اور اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی جو بعد میں اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے ہندوستان کی سیاسیات کے رہنما ہوئے۔ سرکاری ملازمت کی پابندیوں کو اپنے حسب حال نہ پاکر اور اپنے اپنے بلند مرتبت عہدوں سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ میں مقیم ہو چکے تھے۔ مولانا شوکت علی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے سیجوں والے بنگلے کے قریب ایسوسی ایشن کے دفتر میں رہتے تھے اور مسٹر محمد علی ممتاز ہاؤس کے نزدیک ایک چھوٹے سے پکے بنگلے میں اقامت گزین تھے۔

یہ جگہ علی گڑھ کی سیاسیات کے ذکر کے لئے موزوں نہیں؛ تاہم اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ علی گڑھ کالج کی لیلےٰ کے کئی دیوانے تھے اور اُن میں سے ہر ایک اپنے عشقِ صادق کا دعویدار اور اپنے جذبِ کامل کے اثر کا امیدوار۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جن کو سرسید کی ذات سے والہانہ محبت تھی اور جو نواب محسن الملک بہادر کے وقت میں اُن کے دست راست تھے اپنی کوٹھی "آفتاب منزل"

میں میر ولایت حسین کے ساتھ بیٹھ کر کالج کے انحطاط اور تنزل کا دُکھڑا رویا کرتے تھے اور دن رات اِسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کا تعلیمی اور سیاسی دستور اُس مقصد سے الگ نہ ہو جائے جو سرسید کا نصب العین تھا۔

مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی اپنی اپنی جگہ علی گڑھ کالج کے طلبار کی توجہ کے حقدار اور ایک نئے تعلیمی اور سیاسی نصب العین کے علمبردار بنے بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کا دستور اساسی بھی اس سانچے میں ڈھل جائے کہ اس کے طلبار ہندوستان کی قومی تحریکوں اور اپنے وطن کے سیاسی ارتقا میں اُسی آزادی اور سرگرمی سے حصّہ لیں جس آزادی اور سرگرمی سے دوسری اقوام کے طلبار حصّہ لے رہے ہیں۔

اُدھر نواب وقار الملک ان دونوں کے درمیان بعض اوقات تصادم بھی ہو جایا کرتی تھی علی گڑھ کی ناؤ کو اس گرداب سے بچانے کے لئے دن رات ناخدائی کی وہ مصیبتیں جھیلتے رہے جن کا اندازہ صرف وہی ملاح لگا سکتے ہیں جن کی کشتی کو کسی ہلاکت خیز بھنور سے دوچار ہونا پڑا ہو۔

کالج کے طلبار میں اُس وقت سید آلِ حسن اور سید احمد علی جو اپنے اپنے زمانے میں کرکٹ کے کپتان ہوئے، سید فخر الدین ہاکی کے کپتان، سید مسعود الحسن فٹ بال کے کپتان، ملک عبدالقیوم یونین کے وائس پریذیڈنٹ، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالرحمٰن صدیقی، محمد عاشق ڈائننگ ہال کے مستقل مانیٹر، ضیاء الحسن علوی، ظہیر الدین شمسی، فضل متین، محمد شعیب سلام الدین خاں، خواجہ فیروز الدین، لارڈ حیات، قاضی معقول حسن، ممتاز حسن خان، ظہیر زاہدی، ضیاء الحق، اُستاد مقصود حسین، لارڈ اسحٰق، کریم حیدر لودھی، شفقت اشتاق اور بھونڈ وغیرہ نمایاں اور گرانقدر اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے کمرے فرقۂ باطنیہ کے حلقوں کی طرح اُن کے ارادت کیش طلبہ کا مرجع بنے رہتے تھے۔ مجھے ان سب کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور اپنی اپنی جگہ سب مجھ پر مہربانی فرماتے تھے۔

بلند قامت اور تنومند فوجی وردی زیب تن کئے نظر آئے۔ ظاہری وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑے عہدیدار یا فوج کے افسر ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحبزادہ کرنل عبدالقیوم خاں علیا حضرت کے چیف آف دی اسٹاف تھے۔

کرنل صاحب کی زبان پر بس ایک جملہ برابر جاری تھا: "میاں کے مہمان، میاں کے مہمان"۔

بیرے نے میری طرف اشارہ کیا۔ کرنل صاحب نے مجھ سے کڑک کر پوچھا: "میاں کے مہمان کہاں ہیں؟" میں کچھ نہ سمجھ سکا اور حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ آخر کرنل صاحب نے وضاحت فرمائی: "میں حکیم احمد شجاع سے ملنا چاہتا ہوں۔ میاں اُن کا انتظار فرما رہے ہیں۔ وہ میاں کے مہمان ہیں۔ ان کے لئے میاں کا موٹر اور ان کے سامان کے لئے ٹرانسپورٹ کا ٹرک حاضر ہے"۔

اب جو میں نے اپنی ہیئت کذائی پر نظر ڈالی اور اپنے استقبال کے ساز و سامان کی طرف دیکھا، تو مجھے اپنی حالت پر بڑا رحم آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کہتا ہوں کہ میں ہی حکیم احمد شجاع ہوں تو میرے استقبال کے اس سارے اہتمام کی توہین ہوئی جاتی ہے۔ بلا تامل عرض کیا۔ "اطلاع کئے دیتا ہوں سرکار!"

کمرے میں جا کر میں فوراً لوٹ آیا اور عرض کیا: "فرماتے ہیں کپڑے پہن کر حاضر ہوتا ہوں آپ تشریف رکھئے!"

کرنل صاحب ریسٹ ہاؤس کی ایک ڈنڈی چھوٹی کرسی پر بیٹھ گئے۔ آغا وسیم جان دروازے کی چق کے پیچھے کھڑے ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر نہا دھو کر اور کپڑے پہن کر ہم دونوں باہر نکلے۔ اب جو کرنل صاحب نے مجھے دیکھا تو حیران ہو گئے، مگر زمانے کے اس سرد و گرم چشیدہ شریف انسان نے نہ تو اس وقت جتایا اور نہ پھر کبھی یاد دلایا کہ اُس نے حکیم احمد شجاع کے ملازم کو پہچان لیا تھا۔

ہمارا سفر مختصر تھا اس لئے ایک ایک سوٹ کیس اور ایک ایک بستر کے سوا ہمارے ساتھ اور کچھ نہ تھا۔ مگر میں نے ٹرانسپورٹ کے ٹرک کی لاج رکھنے کے لئے عابد سے کہا: "تم سامان کے ساتھ آؤ!"

راستے میں کرنل صاحب نے موٹر روک کر ہمیں بھوپال "تال" کا نظارہ دکھایا۔ اس وقت ٹرانسپورٹ کا ٹرک ہمارے پاس سے گزر گیا۔ ٹرک بالکل خالی نظر آتا تھا اور عابد ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں بہت خوش ہوا کہ کرنل صاحب کی نگاہ اس وقت "تال" کے پار مصروفِ سیر تھی۔

مہمان خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ میری خاطر مدارات کے ایسے اہتمام ہو رہے ہیں جیسے کوئی شہزادہ کسی شہزادے سے ملنے آیا ہے۔ اس وقت فطرت بھی اپنی ساری حسین رعنائیوں کے ساتھ اس منظر کو دلفریب بنانے میں مصروف نظر آتی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، شاداب سبزہ، کھلے ہوئے پھول، مہمان خانہ اس وقت اِندر کا اکھاڑہ نظر آتا تھا اور ہر طرف سے صرف ایک ہی جملے کی گونج سنائی دے رہی تھی: "میاں کے مہمان، میاں کے مہمان!"

اس تواضع کی تفصیل کی جو میرے دو تین روز کے قیام کے دوران میں میرے سامنے آسائشوں اور نعمتوں کا خوانِ کرم بچھاتی رہی یہ جگہ نہیں، مگر میں اس بیان کو یہ کہے بغیر ختم نہیں کرنا چاہتا کہ عزت و عظمت کا وہ پیکر جسے اس کی رعایا "میاں" کے محبوب لقب سے پکارتی تھی اور جسے ہم کالج میں صاحبزادہ حمید اللہ خاں کہا کرتے تھے مجھ سے گیارہ برس کے بعد بھی اُسی سادگی، اُسی محبت اور اسی بے تکلفی سے ملا اور جب تک میں اس کے پاس رہا اس نے مجھے یہ بات یاد تک نہ آنے دی کہ جس پرانے ہم جماعت سے میں اس وقت ہمکلام ہوں وہ اس سرزمین کا آئندہ فرمانروا ہے۔

بھوپال دیکھے اور تاجدارِ بھوپال کی مہمان نوازی کا لطف اٹھائے اب مدتیں ہو گئیں، لیکن جب کبھی اُس طرف کا دھیان آتا ہے تو حافظ کا یہ شعر زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

گرچہ دوریم از بساط قرب ہمت دور نیست
بندۂ شاہ و شمائم و ثنا خوانِ شما

اس زمانے میں علی گڑھ میں کچھ ایسے طالب علم بھی تھے جو بظاہر بہت خاموش نظر آتے تھے، مگر صاحبِ نظر دیکھ سکتے تھے کہ ان کی اس متانت کے پردے میں ارادے کی استواری اور طبیعت کی غیر معمولی صلاحیت چھپی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک جو اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ خان بہادر شیخ فضل الٰہی جو گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے پنجاب میں کنٹرولر آف سپلائیز رہے۔ شیخ عبدالحمید جو لاہور کارپوریشن کے چیف آفیسر تھے۔ خان بہادر نواب زادہ امین اللہ جو نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ڈسٹرکٹ کمرشل آفیسر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ شیخ محمد امین ایم ایل اے پنجاب جو ایک بڑے کامیاب اور مشہور بیرسٹر ہیں۔ خان بہادر محمد زمان خان جو پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب مقرر ہوئے۔ سید اسد محمد علی جو بعد میں ریلوے بورڈ کے ممبر ہوئے۔ ملک غلام محمد جو حیدر آباد دکن میں وزیر مالیات رہے اور پھر پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے، جیسی شخصیتیں ایسی وقعت اور اہمیت رکھتی ہیں کہ ان میں سے ایک ایک کے خصائل اور کمالات کا بیان جداگانہ تبصرہ اور تجزیہ چاہتا ہے۔

اولڈ بوائز کو جو اہمیت علی گڑھ کالج میں حاصل ہے وہ شاید کسی دوسری درسگاہ کے اولڈ بوائز کو حاصل نہیں۔ اسی بنا پر مولانا شوکت علی اور محمد علی علی گڑھ میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے صاحبزادہ آفتاب احمد خان، شیخ عبداللہ اور مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی نے علی گڑھ ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ ان کے علاوہ اکثر اولڈ بوائز جن میں سے کچھ کالج کے ٹرسٹی تھے وقتاً فوقتاً علی گڑھ کالج میں آتے رہتے تھے۔ ان میں مسٹر ظفر عمر ناول "نیلی چھتری" کے مشہور مصنف، خان بہادر مولوی ظفر حسین، سید محمد علی، سید علی حسن اور شیخ احسان الحق جب کبھی آتے تھے تو کالج کے طلبا کی سرگرمیوں میں بڑی محبت اور شفقت سے

حصہ لیتے تھے۔

احمد بخش حجام جنہیں سرسید کے بال اور ناخن تراشنے کا فخر حاصل تھا اب بھی اپنے اصلاحی کام میں بڑی باقاعدگی سے مصروف رہتے تھے۔ جب وہ میرا خط بنانے آتے تو خط بناتے بناتے ان اولڈ بوائز کی ساری داستانِ حیات سُنا جاتے تھے۔

موہن لال پوسٹ مین جب کبھی کسی اولڈ بوائے کو سرسید کورٹ میں دیکھ پاتا تو اسے اس کے نام ہی سے پکارتا: "ظفر میاں، احسان میاں، آج آپ کا کوئی خط نہیں، کل آئے گا!" خدا جانے وہ ان اولڈ بوائز کو دیکھ کر کسی پرانے زمانے میں زندگی بسر کرنے لگتا تھا یا اس کا ذہن اس حقیقت کو سمجھنے سے انکار کر دیتا تھا کہ یہ اولڈ بوائز اب وہ لڑکے نہیں جنہیں موہن لال جانتا تھا۔

احمد بخش اور موہن لال جب تک زندہ رہے علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ اُن کی یہ وابستگی کچھ ایسی ہمیشگی کی صورت اختیار کر گئی ہے کہ اب بھی ہم لوگ جب کالج جاتے ہیں تو سرسید کورٹ کے برآمدے میں احمد بخش کے ریزر تیز کرنے کی کھٹ کھٹ اور موہن لال کے جوتے کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

میں جب علی گڑھ پہنچا تو سب سے پہلے اپنے بہنوئی دیوان سید محمد کا تعارفی خط لے کر نواب وقار الملک بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب کو خواجگانِ چشت سے بڑی عقیدت تھی۔ خط پڑھتے ہی سروقد کھڑے ہو گئے، مجھ کو فرش پر نہیں، آنکھوں پر بٹھایا۔ اپنا مہمان بنایا۔ پھر کالج میں داخلے کا خود ہی بندوبست فرمایا۔ جب تک میں کالج میں رہا، نواب صاحب نے میری نگرانی ایک سرپرست کی طرح فرمائی اور میری تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ جمعہ کی نماز سے پہلے جب وہ مسجد کے دروازے پر طلبا کے استقبال

کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو مجھے اپنا آدمی بھیج کر بلوایا کرتے تھے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ولایت میں میرے بھائی حکیم امین الدین کے ہم سبق تھے، بھائی کا خط لے کر جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے کوئی ابن بچھڑی ہوئی اولاد سے ملتا ہے۔ فوراً اپنے بچوں کو بلایا اور ان سے کہا: "بھائی سے ملو!" انہوں نے اپنے گھر کے دروازے مجھ پر اس طرح کھول دیئے گویا وہ گھر میرا گھر تھا اور اس کی تمام آسائشیں میری منتظر تھیں۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو مسلمانوں کے تعلیمی معاملات سے اس قدر شغف تھا کہ اگر اُسے عشق کی دیوانگی کہا جائے، تو درست ہوگا۔ وُہ ہر روز صبح کے وقت متواتر دو گھنٹے تک آفتاب منزل کے برآمدے یا دالان میں ٹہلتے رہتے اور اپنے کسی نہ کسی لیکچر کی تیاری کرتے۔ اکثر مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ انہیں اپنے آپ سے بڑی بلند آواز میں باتیں کرتے دیکھ کر حیران ہو گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ اُن کے کسی لیکچر یا خطبے کی عبارت ہوتی تھی جسے وُہ اس طرح ادا کرتے تھے گویا وہ اُسے کسی مجمع کثیر کے سامنے ایک یگانہ اندازِ تخاطب سے پڑھ رہے ہیں۔

یہ بات کچھ موزوں نظر نہیں آتی کہ علی گڑھ کالج کا ذکر جمیل ہو اور محض ان متین اور سنجیدہ موضوعات پر ہی اکتفا کیا جائے۔ علی گڑھ کالج کی زندگی کا وہ لطیف پہلو جس کا تعلق طلبا کے باہمی ارتباط سے ہے وہ حسین اور دلفریب منظر ہے جس کی یاد بادۂ دوشینہ کا خُمار ہے اور بہارِ رفتہ کا سرور۔ اس لئے اگر اس دورِ شباب کی بعض نادانیوں کا بیان بھی ہو جائے، تو اچھا ہے۔

ایک دفعہ کپتان احمد علی کے ماموں جو آگرے میں طبابت کرتے تھے، علی گڑھ آئے مجھے یہ شوق تھا کہ میری قوت حافظہ اس قدر تیز ہو جائے کہ جو کچھ پڑھوں ازبر ہو جائے، جب میں نے اُن سے یہ ماجرائے شوق بیان کیا تو انہوں نے میرے لئے ایک شربت

تجویز کیا، اس شربت کی تیاری پر کوئی دس روپے اُٹھے جو اس طالب علمی کے زمانے میں قارون کی دولت کی حیثیت رکھتے تھے۔

شفقت جو اپنے وقت کے مشہور ولر اور کرکٹ کے کھلاڑی تھے اگرچہ مجھ سے کوئی بیس برس بڑے تھے لیکن خوبی قسمت سے میرے کلاس فیلو تھے اس لئے نہیں کہ انہوں نے دیر سے پڑھنا شروع کیا، بلکہ اس لئے کہ انہوں نے بیس برس تک ایف اے کا امتحان پاس کر کے ہی نہ دیا، انہوں نے جب اس شربت کے خواص کا چرچا سنا، تو بن دیکھے ہی اس پر مر مٹے، فرمایا: "ذرا ہم بھی اس کے ایک دو گھونٹ پئیں!"

میں نے عرض کی: "بسم اللہ!"

شربت پیا تو کہنے لگے: "سبحان اللہ یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے، اگر اس کا فائدہ ایسا ہی ہے جیسا اس کا مزا ہے تو کیا کہنے!"

خیر بات آئی گئی ہو گئی میں اور وہ دونوں اکٹھے کلاس میں جایا کرتے تھے، لیکن وہ صرف حاضری لگوا کر باہر چلے جاتے تھے، چونکہ ان کی عمر اکثر پروفیسروں سے بھی زیادہ تھی اس لئے کوئی کچھ نہ کہتا تھا، اب جو میں شربت پیتا، تو ہر روز یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا کہ بوتل بڑی تیزی سے ختم ہوتی چلی جا رہی ہے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جب میں کلاس ہوتا ہوں، تو بھائی شفقت کمرے میں آ کر اپنی قوتِ حافظہ کو تیز کرنے کا سامان کرتے ہیں۔

میں حیران تھا کہ اس متاعِ نایاب کو کیسے بچاؤں! آخر ایک ترکیب سوجھ گئی۔ کالج کے ہسپتال کے ڈاکٹر شجاعت اللہ خاں مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے اور کونین کھانے کے فوائد پر اکثر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کونین کے باقاعدہ استعمال کے ارادے کا اظہار کیا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑے اور دس گرین روزانہ کے حساب سے دس دن کی خوراک سو گرین کونین میرے حوالے کر دی۔

کمرے میں واپس آکر میں نے وہ دو سوگرین کونین کی پُڑیا شربت کی بوتل میں اُلٹ دی اور اُسے ہلا کر طاق میں رکھ دیا۔ اب جو دوسرے دن کالج سے آیا تو دیکھا کہ شفقت بستر پر بیٹھے زور زور سے کراہ رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور اُن کا ہاتھ ہے کہ سینے پر اوپر نیچے برابر حرکت کئے جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا: "خیر تو ہے؟" کہنے لگے: "تمہارا شربت پرانا ہو کر زہریلا ہو گیا ہے۔"

میں نے پوچھا: "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

فرمانے لگے: "آج اس کا مزا ہی کچھ بدلا ہوا ہے۔ زہر کی طرح کڑوا ہے دو گھونٹ کیا پئے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حلق میں انگارے رکھے ہیں۔"

میں دل میں ہنسا کہ انہیں اس چوری کی اچھی خاصی سزا مل چکی ہے۔

ڈاکٹر ڈی کلف کیمسٹری کے پروفیسر جو بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے۔ ان دنوں علی گڑھ کالج میں علم کیمیا کے شیدائیوں کے علاوہ فنِ تمثیل کے متوالوں کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ ناٹک کے تمام شعبوں سے اُن کی واقفیت آفاقی تھی اور ایکٹری کے فن میں تو وہ اس قدر طاق تھے کہ یورپ میں بھی دُور دُور ان کی مثال نظر نہ آتی تھی۔ انھوں نے ہم وارفتگانِ حُسن و شعر کو جو اس طرف مائل پایا تو کالج کی اسٹیج پر شکسپیئر کے کسی ایک ڈرامے کی تمثیل کا ارادہ کر لیا اور اس کے لئے شکسپیئر کا مشہور ڈرامہ "ٹویلفتھ نائٹ" منتخب کیا۔

ملک عبدالقیوم، خواجہ فیروز دین، محمد شعیب قریشی، سید حسن شاہ اور مجھے بڑے بڑے پارٹ ملے۔ اس ڈرامے کے ساتھ ساتھ ہم نے اُردو کا کوئی ناٹک بھی پیش کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے نظرِ انتخاب آغا حشر کے مشہور ڈرامے "صید ہوس" پر پڑی۔ سید حسن شاہ نے نادر کا، خواجہ فیروز الدین نے قزل کا اور میں نے ملکہ مہر عالم کا پارٹ ادا کیا۔ دونوں ڈرامے بڑی کامیابی سے دکھائے گئے اور سب نے انہیں پسند کیا، مگر

نواب وقار الملک بہادر تماشے کے دوران ہی میں اسٹریچی ہال سے اُٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہم یہ تماشہ دوبارہ دکھانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ نواب صاحب کا حکم نامہ قضائے مبرم کی طرح ہمارے سر پر آ دھمکا۔ یہ حکم امتناعی علی گڑھ کالج میں ہمیشہ کے لئے فنِ تمثیل کی موت کا حکم ثابت ہوا۔ ادھر ہمارے ذوق و شوق کا گلا گھٹا اُدھر پرنسپل صاحب کی طلبی ہوئی اور ان سے استفسار کیا گیا کہ ایک اسلامی درس گاہ میں ایسے خلافِ شریعت فعل کی اجازت کیوں دی گئی؟ اب ہم اور ہمارے پروفیسر ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے اور حیران تھے کہ اس استفسار کے جواب میں کیا عذر پیش کیا جائے! آخر اس گناہ سے تائب ہونے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا اور جب تک ہم لوگ علی گڑھ میں رہے ہم نے بھولے سے بھی اس شوق کی تجدید کا ارادہ نہ کیا۔

کالج کے فنڈ سے اس خلافِ شرع کام کے مصارف کی ادائیگی حرام قرار دی گئی اور ہم نے آخر کار خود ہی چندہ کر کے یہ مصارف ادا کئے۔ اس وقت ہم لوگوں کے دل میں سر سید اور نواب محسن الملک کی عزت ملی کی یاد تازہ ہو گئی؛ جو خود فقیروں کا بھیس بدل کر اور بھکاریوں کا روپ دھار کر کشکولِ گدائی ہاتھ میں لئے پھرتے تھے اور کالج کے لئے چندہ جمع کیا کرتے تھے۔

مسعود حسین کمبوہ کو اس نام سے بہت کم لوگ جانتے ہیں، مگر علی گڑھ کالج کے پرانے اور نئے طلباء میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مسعود ڈامی کی محبوب اور دلکش شخصیت سے واقف نہ ہو۔ مسعود مدتوں علی گڑھ کالج کے طالب علم رہے۔ یہ وہی مسعود ڈامی تھے جن کے دماغ کی جدت آفرینیاں، جن کے تخیل کی کارفرمائیاں، جن کی حرکات و سکنات کی بوقلمونیاں اور خلوت و جلوت میں جن کی ہنگامہ آرائیاں علی گڑھ ہی میں نہیں بلکہ سارے یو۔پی میں الف لیلے کے افسانوں سے زیادہ مشہور ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے مسعود ڈامی اور میرٹھ کے تحصیلدار میں کرکٹ کے کسی میچ پر تو تُو

میں میں ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے مسعود کو کالج کا ایک طالب علم سمجھ کر ذرا اپنی حکومت کا رُعب دکھایا۔ مسعود ایسے دل پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے کہ کسی کا رُعب مانیں۔ انہیں اب یہ کھٹک لگی کہ کسی نہ کسی طرح تحصیلدار صاحب کو نیچا دکھائیں اور آخر ان کو ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے سر جیمس میسٹن کو جو اس زمانے میں یو پی کے گورنر تھے اور صوبے کے دورے کے سلسلے میں میرٹھ آنے والے تھے، میرٹھ آئے، میرٹھ کالج کے طلبا کی طرف سے ڈنر کی دعوت دے دی۔

سر جیمس میسٹن بڑے ہر دلعزیز اور نیک دل انسان تھے، انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی۔ دعوت کا انتظام مسعود کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ خان بہادر شیخ وحید الدین اور خان بہادر شیخ بشیر الدین میرٹھ میں بڑے اور چھوٹے بھیّا کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دونوں جُود و سخا کے پُتلے اور احسان و مروّت کے بندے اس آڑے وقت مسعود کے کام آئے۔

ڈنر کا وہ اہتمام ہوا کہ شاید و باید۔ مسلم ہوسٹل کے وسیع ہال میں بھیّا جی کی کوٹھی سے سب سامان آگیا۔ شاہ بلوط کی میزیں، ساگوان کی کرسیاں، چینی کے ظروف اور چاندی کے چھُری کانٹے۔

یونائیٹڈ سروس کلب میرٹھ نے کھانے کا مینو تیار کیا اور اُسی کے تجربہ کار خانساماں نے کھانا پکایا۔ اب ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ مسعود کے پاس ڈنر کے کپڑے نہ تھے۔ آخر اُس کی بھی تدبیر ہوگئی۔ مسعود دلّی گئے اور مسٹر محمد علی کی طرف سے جو اُس وقت کامریڈ کے ایڈیٹر تھے فلپس کمپنی کو اپنے ایوننگ ڈریس کا آرڈر دے دیا۔ حاصل کلام یہ کہ ڈنر کی نشستوں کی جب ترتیب ہونے لگی، تو بیچارے تحصیلدار صاحب کو میز کے آخری کونے میں جگہ ملی اور مسعود میزبانوں کے نمائندے کی حیثیت سے سر جیمس میسٹن کے پہلو بہ پہلو بیٹھے۔ کھانے کے دوران میں ہم لوگ یہ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ مسعود بار بار سب کی آنکھ بچا کر تحصیلدار صاحب کو ذرا جھک کر آداب کر لیتے ہیں۔ مسعود کے جذبۂ انتقام کی تسکین تو

ہو گئی، مگر ڈنر کا بل بھیّا جی کو اور ایوننگ ڈریس کا بل مسٹر محمد علی کو ادا کرنا پڑا۔

۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کا دربار دلّی میں منعقد ہوا۔ اس جشن میں شریک ہونے کی دل میں بڑی خواہش تھی، مگر مشکل یہ تھی کہ جیب خالی تھی۔ جب دربار کے دن بالکل قریب آگئے، تو ایک روز مسعود میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے: "دلّی کا دربار نہیں دیکھتے؟"

میں نے جواب دیا: "اتنے پیسے کہاں ہیں!"

کہنے لگے: "آخر کتنے ہیں؟"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، تو کُل بارہ آنے نکلے۔ انہیں ہتھیلی پر رکھ کر کہا: "ہمارے پاس تو یہ بارہ آنے ہیں۔"

ہنس کر فرمانے لگے: "ذرا بکس میں تو دیکھو!" غرض کرا کرا کے کُل تیئس روپے بنے۔

مسعود نے کہا: "بہت ہیں، لو تیار ہو جاؤ!"

مسعود کا بدن اس قدر فربہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ معتبر معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا رنگ سرخ و سفید تھا اور وہ انگریزی لباس میں انگریزوں سے بڑھ کر انگریز نظر آتے تھے اور انگریزی کا لب و لہجہ اس قدر فرنگیانہ تھا کہ اُن کی گفتگو سے اُن کا ہندوستانی ہونا ظاہر نہ ہوتا۔ لباس دیسی ہو یا انگریزی بہت شاندار پہنتے تھے اور کھانا نہایت پُرتکلف کھاتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں اس ٹھاٹھ سے رہتے تھے گویا بورڈنگ ہاؤس اُن کی جاگیر ہے اور وہ اس کے انتظام کے لئے وہاں مقیم ہیں۔

بورڈنگ ہاؤس سے چلتے وقت مسعود نے مجھ سے وہ تیئس روپے لے لئے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر کہنے لگے: "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کروں وہی کرتے چلے جاؤ!"

میں نے کہا: "بہت اچھا۔" میں نہیں جانتا انہوں نے ریل کے ٹکٹ خریدے یا نہیں۔

مگر وہ دلی کی گاڑی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں جا ڈٹے۔ میں بھی اُن کے ساتھ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ دلی کے کنگروے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو اترے اور اپنے ملازم خیر محمد کو انگریزی لہجے میں حکم دیا: "بھوپال کیمپ میں جاؤ اور مہمان خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ہمارا سلام بولو!"

خیر محمد بہت بہتر حضور کہہ کر چل دیا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کہنے لگے: "دیکھو بھئی پیسے کم ہیں اور گاڑیوں کا کرایہ آج کل زیادہ ہے اور سچ پوچھو تو سیر کا مزا پیدل چلنے ہی میں ہے۔ موسم بھی خوشگوار ہے اور چاروں طرف چہل پہل ہے۔ ابھی جا پہنچتے ہیں۔"

کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ادھر اُدھر کی رونق دیکھنے میں ہم اتنے مصروف ہو گئے کہ ہمیں یاد بھی نہ رہا کہ ہم کہاں ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں۔ پانچ بجے کے قریب ہم "رج" کے سامنے والے بازار میں جا پہنچے۔ وہاں لپٹن کمپنی نے اشتہار کی غرض سے ایک خوبصورت شامیانہ سجا رکھا تھا۔ شامیانے کے نیچے قالین کرسی پر صوفے اور کرسیاں ان کے سامنے حسین و جمیل تپائیاں ان پر براق میز پوش۔ مسعود فوراً جانے کیسے بھانپ گئے کہ یہاں چائے مفت تقسیم ہوتی ہے۔ فرمانے لگے: "کیوں بھئی چائے پیو گے؟"

میں نے کہا: "چائے کا وقت تو ہے۔"

فرمایا: "تو پھر آؤ!"

شامیانے میں جا کر ہم نے بڑے مزے سے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد مسعود نے بڑے سرپرستانہ انداز میں بیرے سے کہا: "انتظام بہت اچھا ہے۔"

اس سفر کی روداد بیان کرنے کے لیے یہ جگہ کافی نہیں۔ بس یہ سُن لیجئے کہ ہم نے ان تین روز میں کبھی تو نیچے اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن کے مہمان خانے میں کھایا، کبھی تاجدارِ رامپور کے مہمان خانے میں، تو نہ کبھی بھوپال کے کیمپ میں تناول کیا، کبھی بہاولپور کے کیمپ میں۔ میں نہیں جانتا مسعود ان سب والیانِ ریاست کے کیمپوں کے منتظمین سے واقف تھے یا

نہیں۔ مگر جہاں کہیں ہم گئے، ہماری ایسی آؤ بھگت ہوئی کہ مجھ کو اس کا یقین ہو گیا کہ ہم کہیں بھی بِن بلائے مہمان نہیں۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن تینوں روپوں میں سے مشکل سے کوئی دس روپے صرف ہوئے ہوں گے۔ تیسرے دن ہم ان شاہانہ دعوتوں اور خاطر مدارات کے تکلفات سے تنگ آ کر دلی چلے گئے۔ میں مسعود سے رخصت ہو کر ممتاز کے ہاں ملیا محل چلا گیا اور مسعود اپنے ایک دوست کے ہاں فراش خانے چلے گئے۔ دوسرے دن شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے مجسمے کی نقاب کشائی تھی۔ میں، ممتاز اور ظہیر زاہدی دوپہر ہی سے جامع مسجد کے سامنے امام صاحب کے بالاخانے پر جا بیٹھے۔ جب شاہی جلوس نکلا تو ہم سب یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ مسعود بے حد شاندار لباس زیبِ تن کیے کسی بہت بڑے انگریز افسر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے جا رہے تھے۔ بعد میں مجھے مسعود کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ رنگ آرباغ کی اس پارٹی میں بھی شریک ہوئے تھے جو والیانِ ریاست کی طرف سے بادشاہ کے اعزاز میں دی گئی تھی اور جس میں ملک کے چیدہ چیدہ اکابر ہی مدعو کیے گئے تھے۔

مسعود شامی کی زندگی کے کارنامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے عجیب و غریب اور اپنی دلکشی کے لحاظ سے ایسے کثیر الاشکال ہیں کہ اس مضمون کا حجم اپنے اندر اُن کے بیان کی گنجائش نہیں پاتا۔ یہ ایک دو واقعات محض تبرکاً لکھ دیئے ہیں تاکہ مسعود کی رُوح جنت الفردوس کی آسودگیوں میں اس درد سے تڑپ نہ اُٹھے کہ ہم اسے اتنی جلدی بھول گئے۔

بلاشبہ یہ دُنیا ایک سرائے فانی ہے اور اس میں جو قافلہ بھی ٹھہرا ہے وہ اسی لیے ٹھہرا ہے کہ رختِ سفر باندھے، ہر وقت چلنے کو تیار رہے۔ مگر چلے جانے والوں کی یاد مٹائے نہیں مٹ سکتی اور وہ دوست جن کے دم سے زندگی خوب صورت نظر آتی

تھی بھلائے نہیں بھولے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

❝کرکٹ میچ کا اجتماع بہت ہی منظم اور شاندار ہوتا تھا۔ ہر
طالب علم یونیفارم میں ملبوس ہوتا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں
کہ کلاس میں، کسی تقریب میں یا ہوسٹل سے باہر کسی طالب علم
کا بغیر یونیفارم کے پایا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات علی گڑھ میں اس
درجہ عام تھی اور اس سختی سے اس کی پابندی کی جاتی کہ اگر
کسی موقع پر اپنے ہی کسی ساتھی کو دوسرے لباس میں
اچانک دیکھ لیتے تو جھجک جاتے کہ وہی
تھا یا کوئی اور❞

پروفیسر رشید احمد صدیقی

میں بڑے تردد اور ناکسی کے عالم میں بریلی لائن سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا، کالج کے ہمسفر طلبا نے حال پوچھے بغیر صرف میری ہیئت و حالت دیکھ کر دلداری نہ کی ہوتی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے میں اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر خود کہیں اور جاکر ساتھیوں کے جھگڑے میں تمام رات ہوحق میں بسر کردی ہوتی، تو میں شہر جاکر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا! ایک وارفتہ اجنبی کے ساتھ علی گڑھ کے ہمسفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج ساٹھ سال بعد بھی میرے دل کو اس طرح شاداب اور شادمان کرتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ ملی۔ اس زمانے (۱۹۱۵ء) میں جون میں داخلہ ہوجاتا تھا، تعطیل کلاں برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پرانے طلباء کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں، وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہوجاتیں۔ موسم کے اعتبار سے جون، جولائی کا مہینہ علی گڑھ میں جس آزمائش کا ہوتا تھا اس سے کچھ اُس عہد کے طلباء ہی واقف ہیں۔ یہ فطرت اور ارباب کالج کی ستم ظریفی تھی یا سازش کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لئے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہوجاتا تھا۔ ابتدا کے دو تین ہفتے بڑی تکلیف و تذبذب میں گزرے۔ کیسی کیسی مصیبتیں اس زمانے میں جھیلیں خیال آتا ہے تو اپنے آپ پر ترس بھی آتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے اور فخر بھی ہوتا ہے

اُس دور میں کالج کی شہرت پورے عروج پر تھی۔ کھیل میں، لکھنے پڑھنے میں، یونین کی سرگرمیوں میں، یوروپین وضع قطع، رئیسانہ طور طریقوں اور شریفانہ رکھ رکھاؤ، چھوٹے بڑوں کے آپس کے سلوک میں، غرض اُس وقت کے معیار سے زندگی کا ہر پہلو بابرکت اور بارونق نظر آتا تھا اور ایک طرح کی آسودگی، احترام اور آرزومندی کی فضا چپے چپے پر چھائی ہوئی تھی۔

جس کسی نے کچی بارک، سید محمود کورٹ، دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ کچی بارک کیا چیز تھی! کوئی عمارت نہ تھی۔ عبادت تھی۔ علامت یا حادثہ تھی، یہ سب تھی بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبے میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیواریں نہایت درجہ بیچا، بودا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں۔ جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم دھول اور دھند میں جھول رہی ہو، وہ کانپتی کوستی، کراہتی، کھانستی محسوس ہوتی۔

شام کو موسم کی سختی کم ہوجاتی، تو لڑکے غسل کر کے صاف کپڑے پہن کر باہر نکلتے اور ایک دوسرے کو پکار کر کوئی تفریحی جملہ کہتے یا فقرہ کستے، جیسے مبارکباد دے رہے ہوں کہ موسم کو زیر کرلیا ہے۔ رات گئے تک طرح طرح کی چہل پہل اور دھوم دھام رہتی۔ ایک طرف اُس زمانے کے علی گڑھ کا وہ ٹھاٹھ، دوسری طرف یہ کچی بارک جہاں ہر حیثیت اور ہر درجے کے گھرانوں کے لڑکے آباد تھے، لیکن باوجود طرح طرح کی تکلیف اٹھانے کے ایک متنفس نے بھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف ہے، یہی نہیں بلکہ کتنے ہی اس کی آرزو کرتے کہ کچی بارک میں جگہ مل جائے!

ایک سال بارش کی شدت ہوئی اور کئی دن تک بند نہ ہوئی۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کچی بارک کا کیا حال ہوا ہوگا! ہم سب کمروں سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ سید محمود کورٹ مشرقی سے نعرہ بلند ہوا، اس کا جواب فوراً مغرب سے دیا گیا، طے کیا گیا کہ محصور ہو کر برسات کا مقابلہ کرنا ناکام رہا، اب میدان میں دادِ شجاعت دینی چاہیے! سب موسلادھار بارش میں جا کھڑے ہوئے۔ کچی بارک کے وسیع صحن میں خوب ڈنڈ اور دھوم مچی۔ تھوڑی دیر کیا دیکھتے ہیں کہ ڈول صاحب کالج کے پرنسپل گھوڑے پر سوار بھیگتے چلے آ رہے ہیں۔ پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" ہم میں ایک بڑا ہی بے تکلف اور بے جھجک تھا، آگے بڑھ کر بولا: "جنابِ والا طوفان آزمائی ہو رہی ہے؟"

ڈول صاحب مسکرائے اور "مبارک ہو!" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوا، تو مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے توسل سے ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جب سے اب تک زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز سے گذری، لیکن اخلاص، یگانگت اور بے تکلفی کے تعلقات بڑھتے اور گہرے ہی ہوتے چلے گئے۔ ذہن کی دراکی میں سہیل صاحب کسی اور کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ ذاکر صاحب اور میں مولانا کے ساتھ کم و بیش چار سال رہے۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، سیر و سفر اور رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ گفتگو یا مباحثے میں فارسی اور اردو کے سربرآوردہ شعرا کے چیدہ اشعار مولانا کی زبان پر اتنے برمحل آتے کہ اکثر شعر ہی سن کر محفل کا رنگ بدل جاتا۔

ایک مرتبہ یونین میں ایک موضوع پر دیر تک جوشیلی تقریریں ہوتی رہیں۔ مولانا سہیل بغیر درخواست اور اصرار کے تقریر نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کا بھی یہی دستور تھا۔ اصرار بڑھا، تو مولانا آمادہ ہو گئے۔ تقریر اس شعر سے شروع ہوئی:۔

قمریاں پاس غلط کردہ خود می دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ باندامِ تو نیست

شعر سنتے ہی واہ واہ سے مجلس گونج اٹھی کیونکہ بحث میں حصہ لینے والوں پر یہ شعر بڑی خوبی سے چسپاں ہوتا تھا۔ اس پر تقریباً آدھے گھنٹے تک مولانا کی کبھی حکیمانہ، کبھی شاعرانہ تقریر جاری رہی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آج جیسی پُرلطف اور دلپذیر تقریر یونین میں کبھی نہ ہوئی ہو۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک موضوع کی مخالفت میں بڑے مزے کی تقریریں ہوئیں۔ محرک کالج کے "سرو قدانِ سیم تناں" میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی تائید میں غالباً کوئی تقریر نہیں ہوئی یا ہوئی بھی تو معمولی درجے کی۔ لوگ تفریحاً طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔ خلافِ معمول مولانا نے تقریر کی اجازت مانگی اور محرک کی تائید کرنے ڈائس پر آئے اور شروع اس شعر سے کیا:۔

دلم بہ پاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد
کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا

حاضرین سے نعرۂ تحسین بلند ہوا اور دیر تک یہ عالم رہا۔ رائے شماری ہوئی، تو قریب قریب سب کے ہاتھ محرک کی تائید میں اٹھے۔

کچھ لوگ مولانا سے غزل لکھوا کر مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ یہ ہمیشہ ہر جگہ ہوتا آیا ہے۔ ایسے حضرات مولانا سے وعدہ لے لیتے تھے کہ جس مشاعرہ میں وہ غزل پڑھی جائے گی مولانا اس میں شرکت نہ فرمائیں گے، اس لئے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ مولانا اس غزل کے متعلق کچھ ایسے فقرے بے خبری یا بے اختیاری میں فرما جاتے کہ پڑھنے والے کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اس سلسلے میں ایک صاحب نے جو مولانا کے دوست بھی تھے مولانا سے اچھا مذاق کیا۔ انجمن حدیقۃ الشعر کی طرف سے یونین میں مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا۔ یہ صاحب مولانا سے

ایک غزل اپنے لئے لکھوا کر لے گئے۔ باری آئی تو پڑھنے سے پیشتر ادھر اُدھر نیچے اوپر دیکھنے لگے جیسے کسی کی تلاش مقصود تھی، صدر مشاعرے نے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ بولے "حضور والا! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کہیں مولانا سہیل تو یہاں موجود نہیں ہیں! سب سمجھ گئے اور یکبارگی بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا، تو صاحب صدر نے فرمایا کہ آج کا مشاعرہ سہیل صاحب کے ہاتھ رہا۔ اس پر پہلے سے بھی زیادہ زور کا قہقہہ بلند ہوا۔

علی گڑھ میں ذاکر صاحب کی پوزیشن بڑی عجیب اور اہم رہی ہے۔ کالج پر ترک موالات کا جو حملہ ہوا، اُس کو موثر اور بامقصد بنانے میں ان کا بہت زیادہ دخل رہا۔ اُس دور کے طلبا میں وہ ہر اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بی اے کے امتحان میں ان کی پوزیشن آئی تھی۔ اس زمانے میں ایم اے او کالج کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے تھا۔ اُن سے قبل یہاں کے متعدد طلبا، الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے کے امتحان میں اول آ چکے تھے۔ لیکن جو بات ذاکر صاحب کو دوسرے طلبا سے ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کورس کی کتابیں نہ خریدتے تھے، نہ پڑھتے تھے۔ زیادہ وقت ادھر اُدھر گھومنے یا جہاں تہاں بیٹھ کر خوش گپیوں میں گزار دیا کرتے تھے۔ لیکن اس میں لٹن لائبریری اور یونین کے دارالمطالعہ کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا تھا۔ رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہو جاتی، تو معلوم ہوتا کہ ہندوستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ پرائیویٹ یا پبلک، ایسا نہ تھا جس کی اُن کو خبر نہ ہو۔

ایم اے او کالج کے عہد میں طلبا اور کالج کے منتظمین میں مخالفت کی بہت کم نوبت آتی تھی کبھی اس طرح کی کوئی بات پیش آ جاتی تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ جلسے، جلوس، تار، تجاویز، نعرے، اسٹرائیک اور فتنہ و فساد کا طوفان برپا ہو جائے۔ اختلاف نے طوالت پکڑی تو طلبا کے نمائندے پرنسپل یا آنریری سیکرٹری سے ملے گفت و شنید ہوئی اور معاملہ

رفت گزشت ہو گیا۔ ایسے مواقع پر ذاکر صاحب ہمیشہ طلبا کے لیڈر ہوتے اور یہ اس بات کی ضمانت ہوتی کہ گفتگو اونچی سطح پر ہو گی اور باہم مفاہمت کی صورت پیدا ہو کر رہے گی۔ اس لئے کہ ذاکر صاحب پر جتنا بھروسہ طلبا کو تھا، اُتنا ہی منتظمین کالج کو بھی تھا۔

علی گڑھ کی دو باتوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک یہاں کا کرکٹ میچ، دوسرے جنازے کا قبرستان لے جانا۔ ایک کا ہمہمہ دوسرے کا حزن۔ کالج میں ایک طالب علم کا انتقال ہو گیا۔ اس کی میت کو جس محبت اور احترام کے ساتھ کالج کے قبرستان تک لے گئے وہ سماں اب تک حافظے میں تازہ ہے۔ کم و بیش دو ہزار طلبا کا مجمع ساتھ تھا، اساتذہ اور دوسرے بہت سے لوگ ترکی ٹوپی، سیاہ شیروانی، کوٹ اور سفید پاجامے میں ملبوس سر جھکائے خاموش ہموار قدموں سے مجمع قبرستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے اس سے زیادہ عقیدت و احترام حسرت و ملال اور راضی برضا رہنے کا کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے میت کا احترام علی گڑھ کے طالب علم جتنا جانتے تھے کوئی اور نہ جانتا تھا۔ جیسے یہ احترام ایک فریضہ تھا۔ جس کے ادا کرنے میں ہر شخص اپنی نظر میں اپنے آپ کو گرامی محسوس کرتا تھا۔

کرکٹ میچ کا اجتماع بہت ستھرا اور شاندار ہوتا تھا، ہر طالب علم یونیفارم میں ملبوس ہوتا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کلاس میں، کسی تقریب میں یا ہوسٹل سے باہر کسی طالب علم کا بغیر یونیفارم کے پایا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات علی گڑھ میں اس درجہ عام تھی اور اس سختی سے اُس کی پابندی کی جاتی کہ اگر کسی موقع پر اپنے ہی کسی ساتھی کو کسی دوسرے لباس میں اچانک دیکھ لیتے تو جھجک جاتے تھے کہ وہی تھا یا کوئی اور!

عیدین کے موقع پر جب یونیفارم کی قید اٹھا دی جاتی تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے طلبا اپنے اپنے مخصوص لباس میں نظر آتے۔ یہ ایک عجیب و دلکش نظارہ ہوتا۔ ایسا نظارہ جو علی گڑھ کے سوا شاید کہیں اور دیکھنے کو نہ ملے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کالج کی بھری بورڈنگ ہاؤس اور سڑکیں غالب کے اس شعر کی مصوری کر رہی ہوں ۔۔

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

لڑکے کرکٹ لان کے تین سمت کھڑے، بیٹھے یا ٹہلتے ہوئے میچ دیکھتے تھے۔ کالج کی یونیفارم میں لڑکوں کا یہ اجتماع ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک نیچی اونچی آدھی ترچھی دیوار بنی گئی ہو، جس کے نچلے حصے پر سفیدی کر دی گئی ہو، وسط سیاہ ہو اور بالائی حصہ سرخ۔ نوجوانوں کا ایک ایسا شائستہ شریفانہ زندگی کی حامل توانائیوں سے بھرپور اجتماع کم لوگوں نے کہیں اور دیکھا ہوگا۔ پھر اپنے کھلاڑی کرکٹ کے اجلے دریتے کے یونیفارم زیب تن کئے فیلڈ میں اطمینان اور وقار سے اُترتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا جیسے آج کا دن صرف ہمارے کارناموں کا دن ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ علی گڑھ کی ٹینس ٹیم میچ کھیلنے باہر گئی۔ میچ ایک مشہور کالج کی ٹیم سے تھا، لیکن جن کھلاڑیوں کے ساتھ میچ ہونے والا تھا، وہ ٹینس کے یونیفارم میں نہ تھے جو اس زمانے میں سفید فلالین یا ڈرل کے پتلون اور سفید ہی فلالین یا ڈول کی قمیص پر مشتمل تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کی ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اس بنا پر کھیلنے سے انکار کر دیا کہ مقابل کے کھلاڑی مناسب یونیفارم میں نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ ٹیم ایسی ٹیم کے ساتھ ٹینس کھیلے جہاں ٹینس کا احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا ہو۔

میچوں میں ہارنے کا بھی خدشہ ہوتا ہے، لیکن اس زمانے میں مجھے اس کا اندیشہ نہیں ہوا کہ علی گڑھ ہار جائے گا۔ کیسے کیسے مشاق اور منجھے ہوئے کھلاڑی تھے جو ہر [illegible] اعتماد کے ساتھ کتنا خوب صورت اور توانا کھیل کھیلتے تھے، ہر کھلاڑی جیسے [illegible] کڑی کمان کا تیر۔

پنجاب کے ایک معزز اولڈ بوائے اور اپنے زمانے کے نامور کرکٹ کپتان کالج آئے ہوئے تھے۔ ایک شام وہ ڈنڈا ٹیکتے ہوئے کھیل دیکھنے آگئے۔ ایک صاحب کے کھیلنے کا انداز دیکھتے ہوئے بگڑ بیٹھے، کیا کمبخت ہے! یہ کھیل بھی کرکٹ ہے؟ کھیل ختم ہوا تو لڑکے کو پاس

بلایا اور بولے: "کیوں جی! ماں کا دودھ پینے کے بعد پھر دودھ میسر آیا؟" دیر تک بڑی شفقت سے اسٹروکس کے انداز بتاتے رہے، لیکن دودھ پینے پر بھی زور دیتے رہے۔

کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا۔ یونین کے وائس پریذیڈنٹ کا درجہ کرکٹ کیپٹن اور انگریزی کے اچھے مقرر کی حیثیت فرسٹ الیون کے اچھے کھلاڑیوں کے برابر تھی۔ اُردو کے اچھے مقرر کا درجہ انگریزی کے اچھے مقرر سے کم سمجھا جاتا تھا۔ جس عہد کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اُردو کے مولانا سہیل تھے۔ عام خیال یہ تھا اور صحیح تھا کہ انگریزی یا اُردو کا کیسا ہی زبردست مقرر کیوں نہ آجائے، ذاکر صاحب اور سہیل صاحب علی گڑھ کی نمائندگی بہتر سے بہتر طور پر کریں گے۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سر کئے! جب اچھی تقریر کرنا قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

۱۹۱۵ یا ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ مسلم اسکولوں کی طرف سے تقریری مقابلے میں حصہ لینے کے لئے پانی پت سے طلبا کی جو ٹیم آئی تھی اس میں خواجہ غلام السیدین بھی تھے۔ سیدین صاحب کی تقریر کا وہ سماں یاد ہے۔ اسٹریچی ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا، بلکہ کہیں کہیں سے چھلک بھی گیا تھا۔ اسکول کے ایک بچے کا اس خوبی، روانی اور دلیری سے علی گڑھ میں تقریر کرنا عجیب سی بات تھی۔ ہر شخص تعریف کر رہا تھا۔ سامعین میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی تھی جو ان کے والد خواجہ غلام الثقلین صاحب سابق طالب علم علی گڑھ کالج سے واقف تھے اور اکثر کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ "باپ کا نام اور کام بیٹے کے حصے آئے گا۔"

ایک صاحب جو پیچھے سے خلاف معمول بیزار معلوم ہوتے تھے بولے: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا، نامور اور نیک نام مسلمانوں کی اولاد اچھی خاصی نالائق پیدا ہونے لگی ہے، یہ لڑکا کیوں اور

کیسے!"

ایک صاحب تقریر سنتے سنتے ساتھی سے کہنے لگے "بھئی واللہ کتنا چھوٹا لڑکا کتنی اچھی تقریر کر رہا ہے۔"

"اس ہال میں ایک سے ایک زبردست بولنے والا موجود ہے۔ لیکن اس پر کسی طرح کا ہراس طاری نہیں۔ میں ہوتا تو منہ سے ٹھکانے کا ایک فقرہ نہ نکل سکتا!" دوسرا بولا۔

ساتھی نے کہا: "چپ ہو جاؤ اب بھی ٹھکانے کا کون سا فقرہ زبانِ فیض ترجمان سے نکل رہا ہے۔ لڑکے کو کیا معلوم کہ ہال میں اچھی تقریر کرنے والے موجود ہیں، اس کو تو صرف تمہاری موجودگی کا علم ہے۔"

اسی زمانے کے آس پاس اسٹریچی ہال میں مسز سروجنی نائیڈو کی تقریر ہوئی۔ بجلی کی روشنی کا انتظام بھی اُنہی دنوں ہال میں پہلے پہل ہوا تھا۔ رات کے وقت تقریر ہوئی تھی۔ طلباء اور اسٹاف کے علاوہ علی گڑھ اور گرد و نواح کے اضلاع کے اشراف اور اکابر بھی شریک ہوئے تھے۔ کتنا جگمگاتا، پُر رونق اور شائستہ مجمع تھا۔ مسز نائیڈو تقریر کرنے کھڑی ہوئیں، ذرا دیر مجمع اور ماحول کا جائزہ لیا۔ ان تمام شیوہ ہائے بتاں کے ساتھ جن کو کوئی نام نہیں دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ بھی جن کو نام دیا گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریر کا یہ عالم تھا کہ جس طرف موصوفہ کی نگاہ اٹھ جاتی یا رُخ پھر جاتا، واقعی کچھ اس طرح کا رنگ نظر آنے لگتا جس کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

اُٹھی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

مولانا سہیل نے اس موقع کی تصویر جس نظم میں کھینچی ہے وہ علی گڑھ والوں میں سے بہتوں کو اب بھی یاد ہوگی، اتنی مختصر لیکن ہر اعتبار سے مکمل اور دل کش نظم یا لفظ مولانا سہیل بھی پھر کبھی نہ لکھ پائے۔ مسز نائیڈو نے بھی اس نظم اور مولانا سہیل کو تادمِ آخر ہر موقع پر یاد رکھا۔

تقریر ختم ہوئی تو کالج کے پرنسپل ٹول صاحب جو صدارت فرما رہے تھے بڑے اتحاد و

اخلاص کے ساتھ اُٹھے اور:

THANK YOU VERY MUCH INDEED MRS. NAIDU کہہ کر بیٹھ گئے۔

مجلس برخواست ہوگئی ہم سمجھتے تھے کہ اس تقریر کے جواب میں موصوف کچھ کہیں گے اور کچھ دیر تک کہتے رہیں گے۔ لیکن ان کی اس مختصر کلامی سے ہم سب متحیر رہ گئے! چنانچہ ایم اے او کالج میں جب کسی بات کو گول کر دیا یا بغیر کسی التفات کے طنزاً یا مزاحاً ختم کر دیا ہوتا تھا تو ٹول صاحب کا یہ فقرہ دہرایا جاتا جو مدتوں کالج میں زبان زدِ عام رہا۔ صاحبانِ ذوق اس فقرے کا استعمال اس لطف اور برجستگی سے کرتے کہ بڑے سے بڑے لوگ کے لئے خفیف اور خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے یونین کا الیکشن زوروں پر تھا ایک پارٹی کمزور پڑ رہی تھی جس کا جنرل اسٹاف بڑے تردد میں مبتلا تھا کہ صورتِ حال پر کس طرح قابو پایا جائے! آخر میں ایک صاحب جن کی حیثیت پارٹی کے ذہن و دماغ کی تھی اس مہم کو سر کرنے نکلے انہوں نے فریقِ مخالف کے ایسے لوگوں کو تاکا جو بڑے چلتے کارکنوں میں تھے اور اپنے امیدوار کی حمایت میں سب کچھ جس میں عقلِ سلیم بھی شامل تھی، داؤ پر لگا دینے کے لئے آمادہ تھے، وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے ہیرو کا قصیدہ پڑھنا شروع کیا اور حریف کے امیدوار کی شان میں کچھ اشتعال انگیز کلمات کہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فریقِ مخالف کے ایک کارکن نے اُن کے ایک چانٹا رسید کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر چشم زدن میں سارے کالج میں پھیل گئی اور اس نازیبا حرکت پر نفرت و نفرین کا ایسا طوفان برپا ہوا کہ فریقِ مخالف الیکشن ہار گیا۔

ہندوستان میں جتنے اچھے بولنے والے تھے ان میں سے بیشتر کی تقریر سننے کا علی گڑھ میں اتفاق ہوا لیکن آج شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ یونین کے وائس پریزیڈنٹ سیکرٹری یا کالج کے بعض طالب علم مقرروں کی جو تقریر ان مواقع پر کسی نہ کسی حیثیت سے ہوتی وہ ایسی

ابھی ہوتی کہ مہمان بے اختیار داد دیتا اور یقیناً اس لئے نہیں کہ ایک طالب علم نے تقریر کا اچھا نمونہ پیش کیا، بلکہ جو تقریر کی گئی تھی وہ فنی اعتبار سے مکمل ہونے کے علاوہ سنجیدہ اور پُر مغز ہوتی تھی۔

کالج میں طلبا کے علاوہ اسٹاف میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے ایف رحمٰن، دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ اولڈ بوائز کی حیثیت سے عبدالرحمٰن صدیقی کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ بڑے قابل، دلیر، ذہین، شجاع اور نرم و نازک نقشے کے خوش رو نوجوان تھے۔ انگریزی میں لاجواب تقریر کرتے تھے۔ اس عہد کی جماعت احرار سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے کالج کا بورڈ میں اسٹاف ان سے بدگمان رہتا۔ گھومتے پھرتے کبھی بورڈنگ ہاؤس میں آنکلتے تو طلبا ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ صدیقی صاحب ہر ایک سے لطف و محبت کا کوئی فقرہ ضرور کہتے اور بڑے بھائی کی طرح شفقت فرماتے۔ وہ علی گڑھ پر نکتہ چینی کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے لیکن ان جیسا علی گڑھ کا شیدائی بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان میں ایک بات جو میں نے بڑی عجیب اور دل نواز پائی، وہ یہ تھی کہ علی گڑھ کے اعلیٰ اور اوسط طبقے سے قطع نظر وہ یہاں کے دھوبی، باورچی، بھنگی، حجام، چپراسی، ڈاکیہ اور خوانچہ فروش سے بھی محبت کرتے تھے اور ان کو یوں یاد کیا کرتے تھے کہ شاید ہی کسی اور علی گڑھ والے نے کبھی یاد نہ کیا ہو۔ جہاں کہیں ہوتے اور علی گڑھ کا کوئی شخص مل جاتا تو وہ اپنے زمانے کے چھوٹے بڑے لوگوں کا نام بہ نام حال پوچھتے اور ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی لطیفہ ضرور سناتے۔

انعام اللہ خاں صاحب بہار کے رہنے والے تھے۔ بڑے شریف النفس، سادہ مزاج لیکن اتنے ہی جذباتی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کس بات پر کس سے کب خفا ہو جائیں گے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ کھانا کھلاتے یا یوں کہئے کہ انڈے کا خاگینہ کھلانے کا بڑا شوق تھا جو تلا ہوا کم اور جھلسا ہوا زیادہ ہوتا تھا۔ دسترخوان کا کام اخبار اسٹیٹسمین کے اوراق سے لیتے

جن کو بچھاتے وقت بڑی سنجیدگی سے کہہ دیا کرتے کہ "صحیح انگریزی لکھنے کی آرزو ہے، تو اسٹیٹسمین ضرور پڑھا کرو!" معلوم نہ ہو سکا کہ اس کہہ دینے سے معذرت کا حق کس کی طرف سے ادا ہو جاتا تھا۔ نیز پان، دسترخوان یا اسٹیٹسمین کی طرف سے۔ پان کثرت سے کھاتے تھے اور بڑے اصرار سے کھلاتے تھے جس میں کتھے چونے کی تہمت کے علاوہ صرف چھالیہ کا ایک ٹکڑا ہوتا۔ وہ بھی اتنا بڑا کہ پان اس کو ملفوف نہ کر پاتا۔ لباس نہایت معمولی درجے کے کپڑے کا ہوتا۔ ضرورت سے زیادہ لمبی شیروانی، سیاہ سوسی کا اٹنگا پاجامہ، دائیں بائیں جھومتے چلتے، اسی انداز سے ترکی ٹوپی کا پھندنا ہچکولے کھاتا۔ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنستے اور کبھی کبھی معلوم نہیں کیا پیچ آن پڑتا کہ یکایک بریک لگا دیتے اور کسی دوسرے عالم میں پہنچ جاتے۔ اپنے عہد کے بڑے ممتاز اور مقبول معلموں میں سے تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے کچھ دنوں اتالیق بھی رہے۔

پروفیسر اے ایف رحمٰن بڑے شرمیلے، شائستہ اور شریف انسان تھے۔ متانت اور تہذیب جیسے ان پر ختم ہو گئی ہو۔ نظر نیچی رکھتے۔ گفتگو کرتے اور کلاس میں لیکچر دیتے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے۔ قیمتی اور اچھے سلے ہوئے سوٹ پہنتے تھے۔ تقریر، لباس اور دوسرے طور طریقوں میں اکثر طلبا ان کی ریس کرتے تھے۔ جس طرح اپنے آپ کو لئے دیئے رہتے تھے ویسے ہی دوسروں کے مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ بے تکلف اور بے محابا اپنے ہم چشموں سے بھی نہ ہوتے تھے۔ انگریزی شیریں اور شائستہ لہجے میں بولتے تھے اور کبھی کوئی ایسا لفظ یا فقرہ منہ سے نہ نکالتے جس کے ثقہ یا معیاری ہونے میں شبہ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انگلستان میں انہوں نے میل جول صرف طبقہ اشراف ہی میں رکھا تھا۔ رہن سہن، وضع قطع اور رکھ رکھاؤ کی جو سطح اپنے لئے پہلے دن مقرر کر لی تھی آخر دن تک قائم رکھی۔ لڑکوں کے اصرار پر یونین کے مباحثوں میں شریک ہونے کے لئے اکثر جاتے۔ ایسے مواقع پر طلبا پروفیسر انعام اللہ خاں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے یونین لاتے اور مباحثے کو ترتیب اس طرح دیتے کہ دونوں

ایک دوسرے کی مخالفت میں تقریر کریں۔

مسٹر ریل انگریزی کے بڑے قابل پروفیسر تھے۔ دوسرے انگریز پروفیسر بھی اُن کی زبان دانی کے معترف تھے۔ اس زمانے میں انگریزی میں ممتاز ہونے کا شوق اس درجہ عام تھا کہ جو طالب علم ریل صاحب کی کلاس یا ٹیوٹوریل گروپ میں ہوتا اس کے بارے میں یہ حُسنِ ظن عام ہوتا کہ اُس کی انگریزی اچھی ہے۔ قاعدے قانون کے خود بڑے پابند تھے اور دوسروں سے پابندی کرانے میں کسی طرح کی رو رعایت گوارا نہ کرتے تھے۔ اس کے صلے یا پاداش میں دو ایک دفعہ کچھ ناخوش گواریاں بھی پیش آئیں، لیکن بحیثیت مجموعی ریل صاحب کا وقار طلبا میں جوں کا توں رہا۔ ڈائننگ ہال کی نگرانی کا کام بھی کبھی کبھی سپرد ہو جاتا اور جس دن اس کی بھنک مل جاتی کہ ریل صاحب کھانے کے وقت ڈائننگ ہال آئیں گے، اس دن ڈائننگ ہال، سرورس روم، باورچی خانہ، ملازمین، طلبا، سب ہی اٹینشن ہو جاتے اور اس قاعدے کا ڈائننگ ہال ہوتا کہ ہم سب یہ محسوس کرتے کہ کسی انگریزی لنچ یا ڈنر میں شریک ہیں۔

ریل صاحب ایک دن اتفاق سے کلاس دیر سے پہنچے۔ لڑکے جا چکے تھے۔ دوسرے دن آئے تو کہا کہ جب تک تم کو یہ نہ معلوم ہو جایا کرے کہ میں رخصت پر ہوں یا مر گیا ہوں، اس وقت تک میری کلاس نہ چھوڑا کرو اور یہ انھوں نے صحیح کہا۔ کلاس وہ اسی پابندی سے لیا کرتے تھے۔

یوروپین اسٹاف نے متفق ہو کر استعفے دے دیا تھا۔ ریل صاحب شام کی گاڑی سے علی گڑھ چھوڑنے والے تھے، لیکن اس دن بھی انھوں نے حسبِ معمول کلاس لی اور پوری توجہ سے آخری منٹ تک پڑھاتے رہے۔ گھنٹہ بجا اور کلاس سے جانے لگے تو کتاب بند کی اور بولے "حضرات خدا حافظ!" اور یہ پہلا موقع تھا جب ہم سب نے محسوس کیا کہ ریل صاحب کی آواز کسی قدر گلوگیر تھی۔

اُدھر ہی پیرجھانی منزل کے نیچے ایک حصے میں جو مارلین روڈ کی سمت کھلتا تھا مولانا سید سلیمان اشرف صاحب اُستاذ دینیات تازیست مقیم رہے، اس وجہ سے یہ مقام تیس پینتیس سال تک مرجعِ افاضل و اکابر رہا۔

سیّد محمود کورٹ مغربی کے اسسٹنٹ ٹیوٹر (وارڈن) کی حیثیت سے اس عمارت کے باقی حصے میں میرا کئی سال تک قیام رہا، اور اس طرح مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مرحوم مجھے نہایت عزیز رکھتے تھے۔ بڑے طنطنے کی شخصیت تھے کسی کا رعب نہیں مانتے تھے، چاہے اس میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اُٹھانا پڑتا ہو لیکن اپنے ساتھیوں طلبا، نیز غریب اور کم حیثیت لوگوں سے بڑے خلوص اور شفقت سے پیش آتے۔ یونیورسٹی کی مسجد میں عصر اور مغرب کے درمیان بغیر کسی معاوضے کے تفسیر کا درس دیتے۔ اس میں شرکت کیلئے کوئی مجبور نہ تھا، لیکن طلبا، اساتذہ اور دوسرے لوگ بڑے شوق اور پابندی سے درس میں شریک ہوتے۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حُسنِ قبول حاصل ہو جاتا، تو اُس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلّم ہو جاتی۔ فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کا کلام علی گڑھ میں بہت پسند کیا گیا۔ حفیظ جالندھری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی بڑا مشاعرہ منعقد ہوتا، تو اس کا اہتمام کیا جاتا کہ موصوف کو ہر قیمت پر بلایا جائے۔

یونین ہال میں انجمن حدیقۃ الشعرا کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ثاقبؔ، صفیؔ اور محشرؔ صاحبان لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ ثاقبؔ صاحب کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ اُن کے یہ دو شعر کالج کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

ہے روشن قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ سیاہ جانبِ کہسار دیکھ کر

ثاقب صاحب نے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے کو کئی بار پڑھا اور ہر بار نئے انداز سے بنا کر پڑھا، اس کے بعد مصرعۂ ثانی فرمایا، تو جیسے پورا مشاعرہ اچھل پڑا اور دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

اس مشاعرے میں جناب اطہر (اپوڑی) پہلی بار شریک ہوئے تھے، موصوف اس وقت تک علی گڑھ میں معروف نہ تھے۔ دو تین ہی شعر پڑھے ہوں گے کہ مولانا سہیل چونکے اور حسبِ عادت فوراً کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ گھٹنوں میں دونوں مٹھیاں لے لیں اور ان پر ٹھوڑی رکھ دی پھر سر ہلا کر بولے: "یہ شخص رموزِ شعر سے واقف معلوم ہوتا ہے!"

جلسے کے بعد مشاعرے کی اچھی غزلوں اور منتخب اشعار کے ساتھ جناب اطہر کے بارے میں مولانا سہیل کا یہ فقرہ بھی لوگوں کی زبان پر تھا۔ واقف کار جانتے ہیں کہ اتنا پہلے اور پہلی بار سہیل صاحب کا فرمانا کتنا صحیح تھا اور فنِ شعر میں اطہر صاحب کی اُستادی کس طرح چالیس سال سے اوپر تک مسلّم رہی۔

سب سے دلچسپ پوزیشن ڈائننگ ہال کی تھی یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی، اس سے پہلے بھی تھی اور آج بھی وہی ہے۔ شکایت کے اعتبار سے ایسا سدا بہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ میری طالب علمی ہی کے زمانے میں پندرہ بیس سال اُدھر کے ایک اولڈ بوائے علی گڑھ تشریف لائے تھے، وہ کھانا کھانے ڈائننگ ہال پہنچے ہال میں داخل ہوتے ہی مسکرائے، پھر بولے: "بوئے جوئے مولیاں آید ہمی" کھانے پر بیٹھے پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ اچھل پڑے بولے: "خدا کی قسم وہی شلجم ہیں!"

ایک صاحب دائمی قبض میں مبتلا تھے اُن کے بارے میں تشخیص ہوئی کہ جب تک وہ ڈائننگ ہال کا کھانا نہ چھوڑیں گے قبض ان کو نہ چھوڑے گا۔ اس لیے ان کا ہاضمہ اتنا قوی

اور ڈائننگ ہال کا کھانا اتنا ضعیف ہوتا ہے کہ کھانے کا فضلہ بھی ان کا جزوِ بدن ہو جاتا ہے۔

ہر طالب کو اختیار تھا کہ وہ مقررہ قیمت ادا کر کے اپنے لئے کوئی اور چیز پکوا لے لیکن ڈائننگ ہال ہی میں سب کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا پڑتا تھا، اس لئے ساتھیوں کا لحاظ کر کے عموماً رئیسانہ ٹھاٹھ کے کھانوں کی فرمائش شاذ و نادر کی جاتی۔ فرمائش چاہے مرغِ مسلّم کی ہو یا متنجن کی یا مونگ کی دال شوربا یا کھچڑی کی ان سب کا نام پتہ ایک ہی تھا یعنی "پرہیزی" طالب علم کی توجہ دلانے پر آواز بھی دی جاتی: "فلاں صاحب کا پرہیزی لاؤ!"

ڈائننگ ہال میں بنیادی کھانے تو چند ہی پکتے لیکن سروس یا ریسرچ روم میں لیب اسسٹنٹ یا باورچی چشم زدن میں ایک کھانے کو دوسرا کھانا بنا دیتے۔ مثلاً کسی صاحب کا پرہیزی ہے، شامی کباب یا سیخ کباب یا کوفتہ یا قیمہ لیکن باورچی خانے میں صرف ایک چیز تیار کی جاتی یعنی اُبلا ہوا قیمہ۔ اسی قیمے کی قلبِ ماہیت اور مناسب ڈریسنگ کر کے اور شکل دے کر شامی کباب، سیخ کباب، کوفتہ یا قیمے کی شکل میں پیش کر دیتے۔ صرف اُبلی ہوئی ترکاری موجود ہوتی۔ ضرورت کے وقت اس ترکاری کو تلیے شوربے دار ترکاری، ترکاری گوشت یا محض ترکاری کی حیثیت دے دی جاتی۔ کھچڑی مانگی تو خشکے اور دال مونگ کو اس طرح ملا کر پیش کیا وہ کھچڑی بن گئی۔ دال مونگ اور خشکہ الگ الگ طلب کیا گیا تو وہ پہلے سے موجود ہوتے۔ چنانچہ تمام نسخے چند مفردات سے تیار کر کے پیش کر دیئے جاتے۔

کھانے کی شکایت کبھی زیادہ ہونے لگتی، تو کسی دن کالج کے آنریری سیکرٹری صاحب باورچی خانے، سروس روم اور ڈائننگ ہال کے ملازمین کو صلواتیں سناتے ایک آدھ بے محل شعر پڑھتے ہوئے گزر جاتے اور سارا گلہ جاتا رہتا۔

ایک شب جوبلی گراؤنڈ میں دو زبردست پارٹیوں میں بلوہ ہو گیا۔ لاٹھیاں چلیں اور فریقین بُری طرح زخمی ہوئے۔ سارے کالج میں خاصی تشویش پھیلی ہوئی تھی، جن دو اشخاص کے سبب یہ ہنگامہ ہوا تھا، ان کی آفس میں پیشی ہوئی۔ ٹول صاحب مسکرائے متحاربین کی تیوری چڑھی تھی

ہمت یا سکت ہی تو اس مسکراہٹ ہی نے سلب کر لی۔ اس کے بعد موصوف نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا: "میں سمجھتا ہوں یہ لڑائی دو گہرے دوستوں میں ہوئی۔ اس لئے تم ہی دونوں کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آئندہ تمہارا باہم دگر کیا سلوک ہوگا۔ فی الحال میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ اچھا بیک روم میں چلے جاؤ اور جو کچھ فیصلہ کرو مجھے آکر بتاؤ۔" پھر گردن کو ہلکی سی جنبش دے کر مسکرائے۔ اس سے فریقین کا رہا سہا دم خم بھی جاتا رہا۔ دونوں بیک روم میں گئے اور جلد ہی واپس آکر بتایا کہ جانبین نے صلح کر لی۔

ڈل صاحب نے فرمایا: "اچھا ہاتھ ملاؤ!" دونوں نے ہاتھ ملائے۔ ڈل صاحب پھر مسکرا دیئے اور فریقین بھاگ کھڑے ہوئے۔ تصفیئے کے تین نازک مرحلے ڈل صاحب نے صرف تین طرح سے مسکرا کر طے کر دیئے۔

بخی بارک کے ایک سینیر طالب علم میرے وطن سے آئے جہاں اُن کے والد گورنمنٹ کے ایک ذمہ دار عہدے پر مامور تھے۔ گھر والوں نے میرے لئے یونیفارم کا کپڑا بھیجا تھا، بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے کمرے میں تشریف لائے۔ گھر والوں کی خیریت تفصیل سے سنائی اور بتایا کہ یونیفارم کا کپڑا لائے ہیں۔ میں نے بے اختیار پوچھا کہ "کہاں ہے؟" مسکرائے اور بڑے اطمینان اور شفقت سے فرمایا: "کمرے میں ہے۔ چار بجے شام کمرے پر آؤ۔ میرے ساتھ چائے پیو۔ کپڑا بھی مل جائے گا۔"

یہ توقف مجھے بڑا شاق ہوا۔ اس زمانے میں میرا یہ حال تھا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ساتھی یا شخص گھر والوں سے مل کر آیا ہے یا وہاں سے کچھ میرے لئے لایا ہے۔ تو طبیعت بے قابو ہو جاتی اور جب تک وہ آدمی یا خبر نہ مل جائے چین نہ آتا تھا۔ بارے وہ وقت آیا اور میں ان کے کمرے میں پہنچا۔ انہوں نے دروازے پر آکر پذیرائی کی۔ دوسروں سے تعارف کرایا۔ کھیلنے اور پڑھنے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا: "کپڑا مرحمت ہو۔ میں جانا چاہتا ہوں۔"

بولے: "ضرور ضرور!" نوکر کو آواز دی، آیا تو بکس کی کنجی اس کے حوالے کی اور کپڑا نکلوایا۔ میں نے چاہا لے کر کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں۔ بولے: "ذرا ٹھہرو! نوکر چائے کے برتن ہٹا دے تو وہ کپڑے صرف دو گز سرج لے کر تمہارے ساتھ جائے گا۔"

میں چاروں خانے چت تھا، لیکن شاید چت ہونے میں ایک آدھ خانہ خالی تھا۔ اس لئے کہ جب میں اپنے کمرے پہ پہنچا، تو وہاں ایک اور سینیر رونق افروز تھے۔ میں نے نوکر سے جھپٹ کر کپڑا لے لیا اور بکس کھول کر رکھنے لگا اور نوکر واپس جانے لگا تو سینیر صاحب نے مجھے مخاطب فرما کر باواز بلند فرمایا: "مولانا دو آنے نوکر کو میں دیئے دیتا ہوں آپ روپیہ بعد میں تڑاتے رہیئے گا۔" اب میں بے شمار خانے چت تھا۔

ہسپتال میں بڑے ڈاکٹر صاحب سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتہ اُن کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شجاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو بر بنائے قافیہ یا علیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا۔ پستہ قد، کہن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری ڈاڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس۔ آواز کرخت، ہاتھ میں رعشہ۔ نسخہ لکھتے تو انگشت شہادت اُچھلتی رہتی۔

اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لئے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست اِدھر اُدھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اس طرح کی مہم میں ہم رکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: "قربان جایئے اس کمال پر ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور ناپ بھی کرتے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا کڑک کر بولے: "بدتمیز نکل جا ابھی ہسپتال سے!"

وہ صاحب فوراً چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ دوسروں نے پکڑ لیا اور ڈاکٹر صاحب سے زیادہ کڑک کر کہا: "یوں نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پر گر کر معافی مانگو ورنہ ہم سب تم کو یہیں مار ڈالیں گے!"

ملزم نے فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔ موصوف خوش ہو گئے اور اُس کو اُٹھا کر گلے لگا لیا۔

میں نے مسلسل چھ سال کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں گزارے اور صرف ایک پورشین سے سابقہ رہا۔ اُن کا اصل نام یاد نہیں۔ ہم سب اُن کو شیخ جی کہا کرتے تھے۔ وہ ہمہ وقت خلجان میں مبتلا نظر آتے۔ چال ڈھال، جسم و جان، بات چیت، سبھی سے جیسے غلط پتے پر کوئی رجسٹری بیمہ یا منی آرڈر دے آئے ہوں اور سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کریں! حالانکہ شیخ جی کی نیکی، سادگی اور ایمانداری کا طالب علموں پر اتنا اثر تھا کہ اگر وہ غلطی سے کسی وقت کسی کو کچھ کا کچھ دے بھی آتے تھے، تو وہ بے چارہ خود پریشان ہو کر شیخ جی کے تعاقب میں بھاگتا پھرتا، لیکن وہ چیز اُن کے حوالے کرتا، تو شیخ جی کو نہ تو کوئی تعجب ہوتا نہ خوشی جیسے وہ چیز دیر سویر خود ہی واپس آ جانے والی تھی، چنانچہ آ گئی اور بس۔

عید کے موقع پر ایک بار ایسا ہوا کہ شیخ جی اپنا تہمد کہیں رکھ کر مسجد میں آ گئے۔ نماز ختم ہوئی، تو سب سے زیادہ معانقے شیخ صاحب کو کرنے پڑے، لیکن بجائے اِس کے کہ فریقین ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے ہر لڑکا یہی کہتا: "شیخ جی میرا کوئی ہے؟" یعنی میرا کوئی خط ہے؟ اور شیخ جی یہی کہتے سب سے کہ: "آپ کا نہیں ہے یا آپ کا ہے۔" یوں نہ لڑکوں کو اس کا خیال رہا کہ اُن کو مبارک باد دیں اور نہ اُن کو فرصت کہ وہ کوئی ایسا جملہ کہتے۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہاں علی گڑھ کے بسکٹوں کا ذکر نہ کیا گیا، تو یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔ یہ بسکٹ یہاں کی زندگی میں بہت زیادہ دخیل رہے ہیں۔ ایم اے او کالج کے عہد میں ان کی مانگ اور کھپت ناشتے کی تمام دوسری چیزوں سے زیادہ تھی۔ اس لئے کہ سستے، مزیدار اور بھاری بھرکم ہونے کے علاوہ ہر وقت ہر جگہ مل جاتے اور اپنے کھائے جانے میں کسی تکلف یا اہتمام کے محتاج نہ ہوتے۔ جب چاہا، جہاں چاہا جس طرح

چاہا کھائے اور کھلائے شتابی سے۔

طالب علمی کے زمانے میں جب اشتہا بالعموم قوی اور جیب بالخصوص ہلکی ہوتی ہے یہاں کے بسکٹوں کی یہ صفات نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھیں۔ علی گڑھ کا کوئی طالب علم ایسا نہ ہوگا جو اُن کی کرامات سے واقف نہ ہو۔ کالج کے زمانے میں یہاں سے وطن جانے والے طلبا دو چیزوں سے ہر جگہ پہچان لیے جاتے تھے۔ ایک تو یہاں کی یونیفارم سے جو زیب تن ہوتی اور دوسرے یہاں کے بسکٹوں کے بنڈل یا چھابے سے جو اُن کے پاس ہوتا۔ بسکٹوں کے ذکر کے ساتھ بڈھے غلام حسین بھی یاد آتے ہیں جو کالج میں یہ نعمت ہمارے لئے فراہم کیا کرتے تھے۔ ان کا سراپا، اُن کا خوانچہ، اُن کی چال، ان کا ڈنڈا جس کی یکساں وقفے کی ہموار کھٹ کھٹ سے ہم کو خبر ہو جاتی کہ غلام حسین آ گئے۔ حساب کسی سے ہفتہ وار ہوتا، کسی سے ماہوار، بہتوں سے علی الحساب یعنی آپ نے جو کچھ دیا انہوں نے لے کر گنا پھر جیب میں ڈالنے کے لئے آمادہ ہوئے، لیکن رُکے اور نئے سرے سے گنا اور پھر پرہیزگاری کی باتوں سے ملنا شروع کیا۔ پھر جیب کے قریب لے گئے اور رُک گئے۔ آپ نے پوچھا: "غلام حسین کیا بات ہے؟"

بولے: "کچھ زیادہ دے دیا ہے!"

آپ نے کہا: "زاید واپس کر دو!"

جواب میں بولے: "نہیں معلوم کتنے زاید ہیں۔"

یہی دقت اُس وقت پیش آتی جب آپ کے پوچھنے پر وہ کہتے: "کچھ کم دے دیے ہیں۔"

آپ پوچھتے: "کتنے کم ہیں؟" تو پھر وہی جواب: "نہیں معلوم کتنے کم دیے ہیں!"

غلام حسین کا ایک مصرف اور بھی تھا۔ آج کل جلسے جلوس کی رونق کا مدار اس پر ہے کہ ہائے ہائے یا زندہ باد، مردہ باد کے نعرے کس بے جگری و بے غیرتی سے لگائے

جاتے ہیں۔ غلام حسین کے عہد میں یہ تقریب اس طرح منائی جاتی۔ رات کے وقت کھانے کے بعد ایک بورڈنگ ہاؤس سے آواز بلند ہوتی: "غلام حسین!" پاس کے بورڈنگ ہاؤس سے جواب دیا جاتا "بسکٹ والا!"

پندرہ بیس منٹ تک یہ سوال جواب طرح طرح کے اونچے نیچے سُروں میں ہوتے رہتے اور پھر بند ہو جاتے۔ دوسرے دن معلوم ہوتا کہ وجۂ احتجاج کیا تھی جس کو دور کرنے کے لئے ضروری کارروائی عمل میں آئی۔ لیکن نہ کہیں احتجاج ہوتا، نہ جلوس نکلتا، نہ اس کارِ خیر میں شریک کرنے کے لئے اسکول کے بچوں کو دعوت دی جاتی اور نہ کسی کی آبرو یا عافیت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا۔

•• صبح کے وقت ملک نور محمد صاحب آئے اور یہ سمجھ کر کہ لحاف پلنگ کے نیچے گر پڑا ہے اُسے اُٹھانے لگے، تو اُس میں سے میں برآمد ہوا۔ ملک صاحب نے میری طرف تعجب سے دیکھ کر کہا:

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میٹرک کا امتحان دے کر آئے ہو اور اگر واقعی تم نے امتحان دیا ہے تو تم یقیناً اس قابل نہیں ہو کہ کالج میں آؤ ••

نواب مشتاق احمد خاں

جب مڈل پاس کر لیا، تو آپا جان نے ہمیں علی گڑھ بھیجنے کا پروگرام بنایا، اب تک ہمارے خاندان کے بچے کالج کی جماعتوں میں وہاں بھیجے جاتے تھے۔ مگر اس خیال سے کہ علی گڑھ کی سپرٹ کو اپنانے کے لئے بنیادی تعلیم بھی وہیں ہونی چاہئے۔ ہمیں سکول میں ہی بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس طرح ایک نئی خاندانی روایت قائم ہو گئی۔

علی گڑھ کا یہ پہلا سفر چچا کریم احمد خاں کی نگرانی میں ہوا جو اس وقت وہاں بی اے میں پڑھتے تھے۔ یہ سفر اور علمی کے روایتی سفر کے مطابق نہیں تھا یعنی ہم لوگ کسی رعایتی ٹکٹ والی سفری پارٹی میں شریک نہ تھے، بلکہ داخلے کی مہم سر کرنے کے لئے رنگروٹ کی حیثیت سے گئے تھے۔

جب تک ہم لوگ حیدرآباد میں رہے بس یوں سمجھئے ایک بھونرے کی زندگی تھی اور ایسی زندگی کو ایک سہانا خواب سمجھتے تھے۔ علی گڑھ جا کر پہلی بار باہر کی دنیا کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ ایک خواب نہیں، بلکہ ایک ٹھوس اور تلخ حقیقت ہے ایک مسلسل جد و جہد جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان گنت سختیاں اور صعوبتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔

علی گڑھ کے اس سفر میں پہلی بار اس ذلت آمیز سلوک کا بھی اندازہ ہوا جو ایک غلام قوم کا مقدر ہوتا ہے۔ آزادی کی نعمت سے ہمیں فیض یاب ہو کر ربع صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہماری نوخیز نسل اندازہ بھی نہیں لگا سکتی کہ آج سے پچاس برس پہلے ریل کے سفر میں ہندوستانیوں کو اپنے ملک ہی میں قدم قدم پر کتنی ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑتی تھی۔ ریل گاڑیوں میں حکمران قوم کے افراد کے لئے ڈبے مخصوص ہوتے تھے جن میں کسی ہندوستانی کا قدم

رکھنا بھی ناممکن تھا اور اگر کوئی مصیبت کا مارا نادانستہ وہاں پہنچ جاتا تھا، تو اس کی بُری گت بنتی تھی۔ یہ ترجیحی سلوک سمندر پار سے آنے والے انگریزوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ اینگلو انڈین اور عیسائیوں کے لئے بھی روا رکھا جاتا تھا۔ اگر کسی گاڑی میں ولایتی اور دیسی انگریزوں کے لئے ڈبہ مخصوص نہیں بھی ہوتا تھا، تب بھی ہندوستانی مسافروں کا انگریزوں یا اُن کی صُلبی اور ذہنی اولاد کے ساتھ سفر کرنا بڑی ہمت کا کام تھا۔ چنانچہ اس سفر میں مجھے اور میرے بھائی اشفاق کو اتفاق سے ایسے ڈبے میں جگہ ملی جہاں دو ٹامی اور اشفاق کا ہم عمر ایک انگریز لڑکا سفر کر رہے تھے۔

اوپر کی برتھ اشفاق کے لئے مخصوص تھی اور نچلی اس لڑکے کے لئے۔ نہ معلوم وہ لڑکا کس طرح اور کس وقت اشفاق کی برتھ پر چڑھ گیا، مجھے اس وقت پتہ چلا جب وہ دونوں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ ٹامی انگریز لڑکے کا ساتھ نہ دیں، مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ جب اشفاق نے پہلی زور آزمائی ہی میں اسے پٹخنی دے دی، تو انگریزوں کی سپورٹنگ قوم کے نمائندوں نے تالیاں بجائیں۔ پٹخنی کھا کر انگریز لڑکے کے ہوش ذرا ٹھکانے آئے اور وہ پشیمان ہو کر پسپائی اختیار کر کے نیچے اُتر آیا، باقی رات اس نے کوئی شرارت نہیں کی، بلکہ چاکلیٹ سے اشفاق کی تواضع کرتا رہا۔

اس واقعے سے میرے ذہن پر یہ بات نقش ہو گئی کہ یہ قوم فطری طور پر بزدل ہے، اگر آپ دبانے سے دب جائیں، تو وہ اور دبائے گی اور اگر جرأت اور حوصلہ مندی سے مقابلے پر ڈٹ جائیں تو وہ آپ کی عزت کرے گی۔

حیدرآباد کے پُرسکون ماحول میں مذہبی تعصب بہت کم تھا اور مختلف فرقے آپس میں امن و آشتی سے رہتے تھے کسی قسم کی تفریق اور معاشرتی چپقلش نظر نہیں آتی تھی، اس لئے اس سفر میں جب جی آئی پی ریلوے کے سٹیشنوں پر "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کی آوازیں سنیں تو بے حد حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے سفر میں کوئی خاص بات نہیں بجز اس کے کہ اس میں ایک ایسے ساتھی سے ملاقات ہوئی جو سکول میں میرے ساتھ تھا، کالج میں ہم جماعت رہا، ولایت میں میرا ہمعصر

ہوا اور پھر ریلوے سروس میں میرا ساتھی بنا۔

محمود عالم سے پہلی ملاقات میں اس کے سراپا کے بارے میں جو چیز مجھے یاد رہی وہ اُس کا گھٹنوں سے نیچا چوڑے گھیر کا کُرتا تھا جو حیدرآباد کے قدیم خاندانوں میں عام طور پر پہنا جاتا تھا مگر میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔

داخلے سے پہلے ہم دونوں بھائیوں کا قیام ایک دن کے لئے ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کے ہاں ہوا جو اس زمانے میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی میزبانی کے انداز کے بارے میں عام روایت یہ تھی کہ وہ ریاضی کے فارمولے کی طرح جچی تُلی ہوتی ہے۔ اس کی تصدیق ہمیں اس مختصر قیام میں ہوگئی۔ اسکول کے صدر مدرس میر ولایت حسین صاحب تھے لیکن نئے انگریز صدر مدرس کا انتظار تھا۔ میرا داخلہ نویں جماعت میں ہوا اور اشفاق کا آٹھویں میں۔ ممتاز ہاؤس کے کمرہ نمبر ۵ میں جگہ ملی۔ یہ کمرہ چار نشستی تھا۔ اس میں ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ حیدرآباد کے دو اور بھائی ظہور الحسن اور ظہور الحق نواب نصیر جنگ آصف جاہی کے فرزند تھے۔

بورڈنگ ہاؤس میں ہمارے نگران ماسٹر عزیز الحسن تھے جو اپنی خشک طبیعت اور نظم و ضبط میں سختی کرنے کی وجہ سے لڑکوں کے لئے ہوا بنے ہوئے تھے۔ گورے رنگ کے بھاری بھرکم آدمی، چہرے پر مسکراہٹ ذرا کم ہی نظر آتی تھی۔ وہ سختی تو ضرور کرتے تھے مگر میرے تجربے کی حد تک وہ بلا وجہ یا بے جا نہیں ہوتی تھی۔

مدرسے کے دوسرے اساتذہ میں ماسٹر نورالحسن، صبیح الدین حیدر اور حسن محمد حیات بہت نمایاں تھے۔ ماسٹر نورالحسن کی بڑی بارعب شخصیت تھی۔ انگریزی کی درسی کتاب، مضمون نویسی اور قواعد پڑھاتے تھے۔ جی بھر کر آموختہ یعنی ہوم ورک دیتے تھے اور اُسے پورا نہ کرنے پر کبھی نہیں بخشتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے انگریزی قواعد کے ایک سوال کا جواب غلط دیا، اس پر ماسٹر صاحب نے حسبِ عادت الفاظ کو ذرا چبا چبا کر جو فی البدیہہ جملہ کہا وہ

میرے حافظے میں ایسا محفوظ ہوگیا ہے کہ اگر اُس کو میں بھولنا بھی چاہوں تو نہیں بھول سکتا۔ انھوں نے فرمایا: "کتے کی دُم کو چاہے کتنا ہی دبایا جائے وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی۔"

ماسٹر صبیح الدین بڑے شفیق اُستاد تھے، تاریخ کا مضمون پڑھاتے تھے اور ایسا پڑھاتے تھے کہ اگر توجہ سے سنا جائے، تو پھر کتاب دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ان کے لباس اور چال ڈھال میں ایک خاص انفرادیت تھی اور وہ ہر وقت پان چباتے رہنا ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔

حسن محمد حیات جو اپنے انگریزی لباس، سج دھج اور نفاست پسندی کی وجہ سے ڈرڈ حیات کے نام سے موسوم تھے۔ ٹھنگنا قد، بھرا ہوا جسم، بس خواجہ ناظم الدین ثانی معلوم ہوتے تھے۔

ماسٹر عبدالکریم فاروقی نے مجھے پڑھایا تو نہیں، مگر والد صاحب کے تعلق کی وجہ سے ہماری دیکھ بھال کو انھوں نے خود ہی اپنی ذمہ داری بنا لیا تھا۔

دوسرے اساتذہ میں عزیز بخش، واجد علی شیدا، اسلم جیراجپوری اور مقام حسین تھے۔ ان تمام اساتذہ نے مسلمانوں کی کئی نوخیز نسلوں کی تربیت کی۔

ہم جماعتوں میں میرا واسطہ زیادہ تر مسعود احمد (شاہد احمد دہلوی کے بڑے بھائی)، متقی محمد علی (نواب محمد علی سیکرٹری کالج کے بیٹے) اور امین احمد خاں (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے چھوٹے بیٹے) سے تھا۔ ہم لوگ ایک ہی بنچ پر بیٹھتے تھے۔ اس لئے مدرسے میں ہر وقت کا ساتھ تھا اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ ہم چاروں میں متقی محمد علی سب سے تیز اور بے حد شریر تھا۔ وہ انگریزی کے مضمون میں بہت اچھا تھا اس لئے ماسٹر نورالحسن صاحب سے اکثر تعریفی کلمات سے نوازا جاتا تھا، مگر اپنی روزمرہ کی نوبہ نو شرارتوں کی وجہ سے خود بھی معتوب ہو جاتا تھا اور ہم لوگوں کو بھی اکثر ناکردہ گناہ مصیبت میں پھنسا دیتا تھا۔ وہ روز اپنی جیب میں چاک بھر کر لاتا تھا اور بنچ کے نیچے لمبا ہاتھ کر کے ہم تینوں کو اور

بعض وقت ساتھ والے بچوں کو بھی باری باری سے اس کا راشن تقسیم کرتا تھا۔

ایک مرتبہ بدقسمتی سے حقی کا دیا ہوا چاکلیٹ میں نے ایسے وقت منہ میں رکھا جب ماسٹر نورالحسن مجھ سے ایک سوال پوچھ رہے تھے پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے! انہوں نے اپنی ناراضگی کا پورا اثر کس مجھ پر خالی کر ڈالا۔

اقامت گاہوں میں شام کو فٹ بال اور ہاکی کا کھیل پابندی سے کھیلا جاتا تھا۔ بعض وقت چاندنی میں فٹ بال اور کبڈی کا کھیل بھی بڑی بہار دیتا۔ میں یوں تو ہاکی اور فٹ بال دونوں کھیلتا تھا لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کھیلوں میں میں نے کبھی کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا، البتہ مجھے ایک موقع پر ایک مشکل زاویے سے گول کرنا یاد رہ گیا ہے۔ اس اتفاقیہ کارگزاری پر مجھے یسین نوری (علی گڑھ کے مشہور فٹ بال کپتان اور بعدہٗ وزیر حکومت بمبئی) جیسے جغادری فٹ بالر نے ایک خاص انعام دیا تھا۔

اسی سال انفلوانزا کی موذی بیماری اتنا نانا سارے ملک میں پھیل گئی جس سے علی گڑھ بھی بری طرح متاثر ہوا۔ اقامت گاہوں کے ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی مریض تھا۔ کالج کے ہسپتال میں بھی مریض بھرے ہوئے تھے، حتیٰ کہ اس کے برآمدوں میں بھی چاروں طرف مریض ہی مریض نظر آتے تھے۔

آج کل جس بیماری کو انفلوئنزا یا فلو کہا جاتا ہے۔ اس سے اس وبا کی شدت کا اندازہ نہ لگایئے۔ پہلی جنگ عظیم کا یہ تحفہ ایک قہر الٰہی تھا جس میں پچاس سے ساٹھ فی صد تک مریض جاں بحق ہو جاتے تھے۔ بیماری کے متعدی اور مہلک ہونے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے بری طرح بھاگتے تھے۔

میرے کمرے میں ظہور الحق بیمار ہوا۔ ہسپتال میں جگہ نہ تھی اس لئے اُسے کمرے ہی میں رکھا گیا اور سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے اس کی تیمارداری کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ اس مہلک بیماری میں وہ آٹھ سال کا بچہ جس طرح اپنے والدین کو یاد کرتا تھا وہ میں کبھی نہیں

بھول سکتا۔ چوتھے روز باپ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ معصوم بچہ چٹ پٹ ہو گیا اور اُسے کالج کے قبرستان جو منٹو (ای) کے نام سے موسوم تھا دفنا دیا گیا۔

منٹوائی کے قبرستان کا ذکر آیا تو ایک دلچسپ بات بھی بتاتا چلوں۔ یوں تو نووارد طلباً سے تازہ بہ تازہ نو بہ نو مذاق کرنا علی گڑھ کی روایت تھی، مگر منٹوائی والا مذاق واقعی لاجواب تھا۔ اگر کوئی نیا طالب علم ہوسٹل کے انتخاب کے بارے میں کسی پرانے طالب علم سے مشورہ کرتا تھا، تو مشورہ دینے والا اگر مخاطب میں سادہ لوحی کے جراثیم دیکھتا تھا، تو بلا توقف منٹوائی کا پتہ دے دیتا تھا اور جب درخواست گزار اپنی عدم واقفیت سے اپنی درخواست میں یہی نام درج کرا دیتا تھا تو اُسے کافی عرصہ تک ندامت رہتی تھی جس کی تلافی اپنی باری پر کسی نووارد طالب علم کو اسی طرح بے وقوف بنانے سے ہی ہو سکتی تھی۔

میں نویں جماعت کے سالانہ امتحان میں دوسرے نمبر پر کامیاب ہوا اور تاریخ، جغرافیہ میں اول آیا۔ اس نمایاں کامیابی سے علی گڑھ کی مخصوص اصطلاح میں جماعت پر کافی "رعب" پڑ گیا۔ ماسٹر صبیح الدین صاحب جن کے مضمون میں میں اول آیا تھا، خاص طور پر توجہ دینے لگے۔ ماسٹر نورالحسن صاحب بھی "کُتے کی دُم" والی بات کو بھول کر زیادہ مہربان ہو گئے۔

اس سال مسٹر اے ایچ مینڈس ہیڈ ماسٹر بن کر آ گئے اور میر ولایت حسین صاحب سیکنڈ ماسٹری پر آ گئے۔ اسی سال حضور نظام کے حکم سے شاہی خاندان کے دو لڑکے خیر نواز جنگ اور حسن یار جنگ علی گڑھ بھیجے گئے۔ ان کی رہائش کا انتظام ایک بنگلے میں کیا گیا جو پائنگاہ ہاؤس کہلاتا تھا۔ اس میں شاہی خاندان کے وہ دونوں لڑکے ملک غلام محمد صاحب (پروفیسر شعبۂ معاشیات بعدہٗ گورنر جنرل پاکستان) کی زیر نگرانی رہتے تھے۔

آج سے پچاس برس پہلے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شاہی خاندان کے لڑکے عوام کے ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے نظام کا یہ اقدام جمہوریت کا پیش خیمہ تھا اور ان کی دور اندیشی کی نشاندہی کرتا تھا۔

میٹرک کا امتحان دے کر میں اپنے چچا کریم احمد خاں کے پاس جو وہاں بی اے میں پڑھتے تھے سرسید کورٹ میں چلا آیا۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی میرا جی گھبراتا تھا یا دو چار اکٹھی چھٹیاں ملتی تھیں، تو انہیں کے پاس آجایا کرتا تھا۔ اس طرح مجھے ان کے ہم جماعتوں اور دوستوں سے اسکول کے زمانے ہی میں واقفیت ہو گئی تھی۔ اُن کے ہر وقت کے بیٹھنے اُٹھنے والے ساتھیوں میں اس وقت ملک نور محمد خاں (آف سرگودھا بعدہٗ نواب بہادر) اور پروفیسر ولایت احمد خاں کے بھائی شیخ وزیر احمد تھے۔ علی گڑھ کے نامور گرانڈی راجہ لعل حسین صوفی احمد بخش اور سعید الزماں کا بھی ان سے یارانہ تھا۔ ان لوگوں سے پہلی ملاقات کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جب میں کالج میں آیا، تو علی گڑھ کی مخصوص روایت کے مطابق فرسٹ ایئر فول، چارپائی الٹائے جانے یا فاختہ اُڑانے کے ناخوشگوار تجربے سے یک گونہ محفوظ رہا۔

جب میٹرک کا امتحان دے کر میں اس مرتبہ چچا کے پاس آیا تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ سردیوں کی رات تھی۔ میں لحاف میں لپٹا لپٹایا کروٹ لیتے ہوئے فرش پر گر پڑا اور رات بھر وہیں پڑا سوتا رہا۔ صبح کے وقت ملک نور محمد صاحب آئے اور یہ سمجھ کر کہ لحاف پلنگ سے نیچے گر پڑا ہے، اسے اٹھانے لگے، تو اس میں سے میں برآمد ہوا۔ ملک صاحب نے میری طرف تعجب سے دیکھ کر کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میٹرک کا امتحان دے کر آئے ہو اور اگر واقعی تم نے امتحان دیا ہے، تو تم یقیناً اس قابل نہیں ہو کہ کالج میں آؤ۔"

بات تو ٹھیک تھی کالج میں آنے والا لڑکا رات کو سوتا ہوا پلنگ سے نیچے گر جائے، رات بھر سردی میں اسی طرح پڑا رہے اور اسے پتہ ہی نہ چلے، یہ کیسے ممکن تھا۔ اس حادثے سے ملک نور محمد صاحب نے میرے متعلق جو کچھ بھی رائے قائم کی ہو میں بہرحال میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو کر کالج پہنچ گیا۔

علی گڑھ میں چار سالہ قیام کی خوشگوار یادیں میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اقطائے ہند سے طلب علم کی خاطر قوم کے نونہال کشاں کشاں آتے تھے اور وہاں کے ماحول میں گھل مل کر

ایک ہو جاتے تھے۔ بنگالی ہوں یا پنجابی، حیدر آبادی ہوں یا مدراسی، بمبئی کے سیٹھ ہوں یا سرحدی پٹھان، سب ایک ہی لباس میں جو ترکی ٹوپی، کالی اچکن اور سفید پاجامے پر مشتمل ہوتا تھا ایک ہی ثقافت اور معاشرت کے علمبردار بن جاتے تھے۔ ایک ہی زبان بولتے تھے اور ایک ہی جذبے سے سرشار ہو کر "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" کی عملی تفسیر بن جاتے تھے۔ وہاں کے در و دیوار سے محبت ہو جاتی تھی اور وہ محبت دل و دماغ پر انمٹ نقش چھوڑ جاتی تھی اور انہیں بار بار دیکھنے کو جی ترستا تھا۔

یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسٹریچی ہال، آسمان منزل، پکی بارک اور جامع مسجد جس کی آغوش میں سرسید احمد خاں اور ان کے ذی احترام ساتھی محو خواب ہیں، کی یاد نہ ستاتی ہو اور وہ حسین عمارتیں خواب میں نظر نہ آتی ہوں۔ اس مادرِ علمی کا وہ کون سا فرزند ہے جس کے کانوں میں وہاں کے خوانچے والوں کی آوازیں نہ گونجتی ہوں۔

گزک علی گڑھ کا خاص تحفہ تھی۔ "علی گڑھ کی خستہ گزک، ابڑی نامی گزک! علی گڑھ کی نامی گزک!" کی میٹھی آواز کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے یہ آواز ویسے ہی دلفریب اور لوچدار تھی جیسے لکھنؤ کے کنجڑوں کی آواز "لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں کیا خوب ککڑیاں ہیں!"

بعض خوانچے والوں کی شخصیت بھی خاص ہوتی تھی۔ اگر علی گڑھ کی زندگی کے ہمہ جہتی پہلوؤں کی کبھی کوئی تاریخ مرتب کی جائے، تو مجھے یقین ہے کہ ممتاز فیرینی والے کا نام اس میں ضرور آئے گا۔

علی برادران کو جب چھندواڑہ سے رہائی ملی، تو علی گڑھ سے جو انہیں لگاؤ تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ گھر جانے کی بجائے پہلے مادرِ علمی کی زیارت کے لئے علی گڑھ آئیں جس کی آغوش میں ان محترم بھائیوں نے حریت کا سبق پڑھا تھا۔ بی اماں نے بھی ان کا علی گڑھ ہی میں خیر مقدم کیا۔ ریلوے اسٹیشن سے کالج تک علی برادران کا استقبالی جلوس بڑی شان سے نکلا۔

اُس زمانے میں عوام اپنے اکابر کا استقبال اپنی مرضی اور محبت سے کرتے تھے۔ انہیں ڈنڈے کے زور سے اس مقصد کے لئے جمع نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس جلوس میں جو جذبہ تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسٹیشن سے ان کی گاڑی کو کالج کے لڑکے کھینچ کر لے گئے۔ ہر دس قدم پر گل پاشی ہوتی تھی اور علی برادران زندہ باد، بی اماں زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگتے تھے۔

علی گڑھ میں پہلی مصروفیات ان کی ایک کرکٹ میچ تھا جس میں مولانا جوہر علی نے اپنی بیٹنگ کے جوہر دکھائے۔ نواب زادہ حمید اللہ خاں بھوپال نے وکٹ کیپری کی۔

اسٹریچی ہال میں اُن کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا جس میں مولانا محمد علی جوہر نے انگریزی میں ایسی معرکہ آرا تقریر کی کہ اگلے دن ہمارے انگریز ہیڈ ماسٹر نے اسمبلی کے وقت ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "کاش کہ میں محمد علی جیسی انگریزی بول سکتا!"

ان رسمی مصروفیات سے زیادہ ان کی غیر رسمی ملاقاتیں تھیں، مثلاً کچی بارک میں پہنچ کر علی برادران نے جس چیز کی فرمائش کی وہ ممتاز کی فیرنی تھی۔ انہوں نے فیرنی ہی نہیں کھائی بلکہ ممتاز فیرنی والے سے معانقہ کیا اور اس سے باتیں کر کے اپنی طالب علمی کی خوشگوار یادیں تازہ کیں۔ کیوں نہ ہو ممتاز اور دوسرے خوانچے والے، علی گڑھ کی کئی نسلوں کو مزے مزے کی چیزیں کھلا کر کالج کی زندگی میں ایک عجب لطف پیدا کرتے آرہے تھے اور یوں خود علی گڑھ کی زندگی کا ایک اہم عنصر بن گئے تھے۔

کالج میں ریاضی، تاریخ اور منطق میرے اختیاری مضامین تھے۔ ریاضی کا مضمون شروع میں پروفیسر عبدالمجید قریشی نے پڑھایا لیکن بعد ازاں عمر حیات ملک پڑھاتے رہے۔

پروفیسر انعام اللہ خاں جو اپنی طبیعت، لباس اور خاص مزاج کی وجہ سے ایک منفرد شخصیت کے حامل تھے منطق پڑھایا کرتے تھے۔ ہمارے سیکشن کے لئے انگریزی کا اُس وقت کوئی مستقل اُستاد نہ تھا۔ زیادہ تر لیفٹیننٹ حمیدالدین نے پڑھایا جو فارسی کے ایم اے

تھے۔ اس بارے میں لطیفہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے میری انگریزی عبارت کو دیکھ کر پروفیسر کا نام پوچھا۔ جب میں نے نام بتایا تو انہوں نے فرمایا "بس اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب فارسی کے ایم اے اپنا مضمون چھوڑ کر انگریزی پڑھانے لگیں تو یہی نتیجہ ہوگا۔"

ایک مولانا ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ ان کا نام تو یاد نہیں، مگر ان کے بھاری کم جثے اور نمایاں توند کی رعایت سے وہ طلبا میں "مولوی مٹکا" کے لقب سے مشہور تھے۔ نام لینے کے معاملے میں طلبا اساتذہ کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب کسی وجہ سے شاکی ہوگئے، تو وہ شفاعت اللہ سے ہلاکت اللہ بن گئے اور اپنے نام سے زیادہ طلبا کے دیئے ہوئے نام سے پکارے جانے لگے۔

مجھے سرسید کورٹ میں بڑے پھاٹک کے قریب اس کمرے میں جگہ ملی جہاں پہلے میرے چچا کریم احمد خاں رہا کرتے تھے۔ کالج میں اس وقت کے بعض طلبا ایسے تھے جنہوں نے بعد میں پاکستان اور ہندوستان میں بڑے اعزازات حاصل کئے۔ مثلاً انتہائی سنجیدہ قسم کا نوجوان گورا چٹا دلفریب شخصیت کا مالک تحریر و تقریر کا ماہر ڈاکٹر حسین، سید نور اللہ جس نے یونین کے اُس جلسے کی صدارت کی جس میں ہندوستان کے سیاسی اکابر نے عدم تعاون کی تحریک پر طلبا سے خطاب کیا۔ رشید احمد صدیقی وہ ادب کی خاص صنف میں ابھی اُس مقام پر تو نہیں پہنچا تھا جو بعد میں اُسے حاصل ہوا لیکن طلبا میں پھر بھی صاحب طرز ادیب ہونے کی شہرت حاصل تھی۔ وہ ٹینس بہت اچھی کھیلتا تھا چنانچہ میں نے پہلی بار اُسے ٹینس کورٹ پر ہی دیکھا تھا جہاں وہ تنہا جال کی جگہ دو چارپائیاں کھڑی کر کے اپنے استادی ہاتھ کی مشق کر رہا تھا۔ خواجہ غلام السیدین، خواجہ منظور حسین، مجیدالدین، حبیب الرحمٰن اور ابن حسن زبیری۔

یہ اساتذہ میں ان استادوں کے علاوہ وہ ہیں جن کی میں نے شاگردی کی۔ علی گڑھ میں اُس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر ولی محمد، پروفیسر میاں محمد شریف، مولانا سلیمان اشرف،

پروفیسر کریم حیدر لودھی، پروفیسر اللہ بخش اور فیروز الدین مراد خاص طور پر نمایاں تھے۔ ملک غلام محمد بھی ایم اے کر کے شعبۂ معاشیات سے منسلک ہو چکے تھے۔ زندہ دلان کالج نے اُن کی طبیعت کی مناسبت سے انہیں "غلام محمد مغالطہ" کا خطاب دے رکھا تھا۔ ایک دوسرا خطاب لارڈ نوز بری (NOSE BURY) بھی رائج تھا جو غالباً ان کے جسمانی ڈھانچے کے ایک حصّے کے نمایاں ہونے کی مناسبت سے پڑ گیا تھا۔

کالج میں یہ بڑے ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ عدمِ تعاون اور خلافت کی تحریکیں پروان چڑھ رہی تھیں، علی برادران اور دیگر اکابرین بار بار علی گڑھ آ کر طلبا کو خطاب کرتے تھے۔ علی برادران کے ساتھ ان کی قابلِ احترام والدہ بی اماں کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا۔ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کا دل سوز نعرہ گلی گلی میں سنائی دیتا تھا اور اسے سُن کر بڑی بوڑھیاں بھی آنسو بہانے لگتی تھیں۔

اسی زمانے میں گاندھی جی بھی اپنے حواریین کے ساتھ علی گڑھ آئے۔ مولانا محمد علی نے تو علی گڑھ کو اپنا مستقر ہی بنا لیا تھا اور وہ دن میں کئی کئی بار سرسیّد کورٹ میں طلبا کے مجمع میں تقریر کرتے تھے اور روزانہ بعد مغرب مولانا سلیمان اشرف سے کسی نہ کسی بات پر اُلجھ پڑتے تھے۔ ہم لوگ بڑی دلچسپی اور شوق سے اُن دونوں کی گرماگرم بحث سنتے اور اُن کی آپس کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

جب عدمِ تعاون کی تحریک پورے زوروں پر آگئی، تو ایک دن یونین کے ہال میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس کی صدارت کے فرائض سیّد نور اللہ نے انجام دیئے۔ علی برادران، مولانا آزاد سبحانی اور دیگر اکابر نے بڑی دھواں دھار تقریریں کیں۔ طلبا میں بڑا جوش تھا اور جب مولانا شوکت علی نے "سپردم بتو مایۂ خویش را۔ تو دانی حساب کم و بیش را" کہہ کر اپنی تقریر ختم کی، تو طلبا نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ اس دن کی جذباتی تقریروں سے متاثر طلبا کی ایک کثیر تعداد نے کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیّہ میں داخلہ لے لیا۔ مولانا محمد علی

نے اس ادارے کی بنیاد علی گڑھ ہی میں رکھ دی تھی اور خیموں اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔

انتظامیہ نے اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے کالج کو بند کر دیا اور والدین کو مطلع کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کو بلوا لیں۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ میں بھی اُس رَو میں بہہ جاؤں، مگر پھر کچھ سوچ کر گھر جانے کی بجائے عارضی طور پر میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ دو تین مہینوں میں جب جذبات کی شدت میں کمی ہوئی اور حالات ذرا بہتر ہوئے تو میں پھر علی گڑھ لوٹ آیا۔ چند مہینوں کے بعد جامعہ ملیّہ بھی دہلی منتقل ہو گیا۔ ان تین چار ماہ کے ہنگاموں کے بعد مسلمان عام طور پر یہ محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے جذبات میں بہہ کر اپنا نقصان کیا ہے۔ علی گڑھ میں تعلیمی سال کی بربادی ہوئی۔ نظم و ضبط متاثر ہوا اور اس سارے دور میں بنارس ہندو یونیورسٹی پر کوئی آنچ نہ آئی، مگر ہندوستان طرفوں نے علی گڑھ کو قربانی کا بکرا بنا لیا۔

کالج میں لوٹنے کے بعد مجھے سرسیّد کورٹ میں مشرقی کی بجائے مغربی حصے میں جگہ ملی۔ میرا روم فیلو ایک حیدرآبادی لڑکا آصف علی بیگ تھا۔ علی گڑھ کی فضا میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہر قسم کا مغالطہ رفع ہو جاتا تھا اور ہر لڑکے کے اچھے اور بُرے پہلو بالکل سامنے آجاتے تھے۔ وہیں جا کر میں نے محسوس کیا کہ میری طبیعت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شرمیلی ہے۔ اس پر کم آمیزی مستزاد، پھر اس کے ساتھ ذکی الحس بھی تھا۔ ان خامیوں کی وجہ سے مجھے وہاں کافی پریشانی اور کوفت اٹھانی پڑی۔ انہی ایام میں طلبا برادری کے سالانہ اعزازات کی فہرست میں میرا نام بھی آیا۔ پورا قصیدہ تو یاد نہیں، مگر جو اشعار میری شان میں لکھے گئے تھے اور طلبا کے سالانہ گزٹ میں شائع ہوئے اُن کا آخری مصرعہ یہ تھا کہ

نام سُنتا ہے اگر تو کو سنو مشتاق ہے

اسکول کی طرح کالج میں بھی میں نے کھیلوں میں کوئی حصّہ نہیں لیا، صرف کبھی کبھار

ہاکی کھیل لیتا تھا۔ زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ فرسٹ ایر کے سالانہ امتحان میں میں نے تاریخ میں بہت اچھے نمبر حاصل کئے اور منطق اور دینیات کے مضامین میں اوّل آیا۔ میں کلاس میں بہت ہی خاموش طلبا میں سے تھا۔ اس لئے پروفیسر صاحبان بھی مجھ سے زیادہ واقف نہ تھے۔ منطق کے مضمون کے نتیجے کا اعلان کرتے ہوئے پروفیسر انعام اللہ خاں نے میرا نام لے کر کھڑا ہونے کی ہدایت کی۔ جب میں کھڑا ہوا تو کہا، "ارے تم، تمہاری تو کبھی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

علی گڑھ میں فرسٹ ایر اور تھرڈ ایر کے امتحانوں میں اوّل آنے والوں کو علی الترتیب جونیر اور سینیر سکالر کہا جاتا تھا۔ ان کے نام ایک بورڈ پر لکھ دیئے جاتے تھے۔ اس سال مجھے جونیر سکالر بننے کا شرف حاصل ہوا۔

فرسٹ ایر میں مجھے جونیرز ڈبیٹنگ سوسائٹی کے انتخاب میں کھڑا ہونے کی دعوت دی گئی۔ میری کامیابی کے امکانات بظاہر اچھے تھے۔ لیکن میرے ایک دوست نے جب مجھے یقین دلایا کہ میرے جیتنے کے امکانات کم ہیں، تو اُن کے خلوص پر بھروسہ کر کے میں نے اپنی نامزدگی واپس لے لی۔ میرے اس اقدام کے ساتھ ہی میرے مشورہ دینے والے دوست نے اپنی نامزدگی کے کاغذات داخل کر دیئے۔ اس عمر میں دوستوں کی بے وفائی اور خود غرضی کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا جس سے مجھے بہت صدمہ ہوا اور دوستی کے جذبے کو بہت ٹھیس لگی۔ میں چاہے منتخب ہوتا یا نہ ہوتا، مگر میرے دوست کو میرے ساتھ یہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ بہرحال بھلے اور بُرے آدمی ہر جگہ پائے جاتے ہیں خواہ وہ علی گڑھ ہی کیوں نہ ہو۔

•• ایک بزرگ اصغر علی صاحب دوران الیکشن میں سیدین کی طرف سے پیش پیش تھے۔ کسی مسخرے نے اُن کی شان میں کچھ اشعار کہے۔ ایک مصرع یہ تھا ؎

یہ شُتر بھی محملِ لیلےٰ کے قابل ہو گیا

یہ مصرع ایسا موزوں اور برمحل تھا کہ میں اسے آج تک نہ بھولا۔ اصغر علی صاحب دراز قد تھے اور چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی تھی ••

علی مقصود صاحب ایڈووکیٹ

شام کا وقت تھا جب میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر اترا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کی کوئی شام تھی، تاریخ مجھے یاد نہیں۔ اب اس پریشانی میں مبتلا ہوگیا کہ آخر رات کہاں گزاروں! یونیورسٹی میں کسی کو جانتا نہیں تھا جو وہاں پہنچ جاتا۔ مجبوراً یہی طے کیا کہ رات اسٹیشن پر گزار دوں۔

صبح ہوتے ہی اسٹیشن سے باہر آیا اور ایک یکہ والے کو اشارہ کیا۔ اس نے دریافت کیا کہ صاحب کیا۔ "منٹو سرکل چلوں؟" میں نے کہا: "نہیں کالج چلو۔" میں نہیں سمجھا کہ آخر یہ منٹو سرکل بزرگ کا نام ہے۔ اتفاقاً ایک صاحب مل گئے۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگر مجھے فرسٹ ایئر میں داخلہ لینا ہے تو منٹو سرکل جانا ہوگا۔ بس اللہ کا نام لے کر اس مہم کو سر کرنے کے لئے میں منٹو سرکل چل دیا۔

پھاٹک سے اندر جاکر بائیں طرف نظر ڈالی، تو ایک بڑا مجمع نظر آیا۔ کچھ لوگ برآمدے میں اور کچھ برآمدے سے باہر ٹہلتے باتیں کرتے اور کچھ خاموش کھڑے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ یہ دفتر ہے اور یہ سب لوگ داخلے کے لئے دفتر کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں بھی برآمدے میں ایک جگہ کھڑا ہوگیا۔ ہر شخص شیروانی یا نکس کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ مجھے اپنے لباس پر بڑی شرم آ رہی تھی میں ایسا کوٹ پہنے ہوئے تھا جو نہ تو کوٹ ہی تھا اور نہ شیروانی ہی۔

تھوڑی دیر میں موٹر سائیکل پر ایک یورپین صاحب تشریف لائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پرنسپل ہیں۔ اُن کے دفتر میں ڈرتے ڈرتے گیا اور گھبرائی ہوئی آواز

میں کہا: "میں فرسٹ ایئر سائنس میں داخلہ چاہتا ہوں۔"

پرنسپل صاحب نے چپڑاسی کو بلایا اور مجھے متعلقہ کلرک کے پاس بھجوا دیا دوسروں کی مدد سے فارم بھرے اور فیس کی رسید حاصل کی۔ اب مجھے ہدایت ہوئی کہ ممتاز ہاؤس کے ٹیوٹر کے پاس جاکر کمرہ لے لوں۔ یہ پہلی رکاوٹ تھی جو بخیر و خوبی گزر گئی۔

ممتاز ہاؤس میں مجھے کمرہ نمبر ۳۹ دیا گیا۔ اس میں میرے روم فیلو چودھری امیر حسن صاحب تھے۔ یہ صاحب بدایوں کے رہنے والے تھے، اس لئے یک گونہ سکون ہوا، لیکن چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ انہوں نے کسی دفتر میں ملازمت کر لی۔ اور ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ امتحانات دینا شروع کئے۔ اس طرح ایم اے کر لیا اور پھر یہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر کے دست راست بن گئے اور لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ مجھے ان کا کمرہ چھوڑنا بُرا نہ لگا، اس لئے کہ وہ حیات کرنے کے عادی تھے۔ کیمسٹری کے فارمولے بآسانی رٹ کر لیا کرتے تھے اور کھانا اس قدر جلدی کھاتے کہ میں اکثر بھوکا رہ جاتا مگر مروت سے مجبور کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ آج کل وہ ریٹائرڈ پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن صدیقی، سابق ڈین شعبۂ آرٹس کراچی یونیورسٹی ہیں۔

کیمسٹری اور فزکس میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ کئی لوگوں کے احسان سر پر لئے ہوئے کسی نہ کسی طرح امتحان تو پاس کر لیا، مگر آئندہ کے لئے توبہ کی اور بی اے میں پہنچ کر مضامین بدل لئے۔

داخلہ لینے کے بعد میری سب سے پہلے ملاقات خواجہ مسعود علی سے ہوئی، جو آگے چل کر مسعود علی ذوقی کہلائے۔ بے حد ذہین اور بے انتہا دلچسپ انسان تھے۔ جو اثر میرے دماغ پر ان سے پہلی ملاقات میں ہوا تھا وہ اب تک قائم ہے۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد اُن سے میرے تعلقات بدستور قائم رہے اور آج بھی وہ میرے مخلص دوستوں میں سے ایک ہیں۔ گفتگو بہت دلچسپ کرتے ہیں، پبلک پلیٹ فارم ہو یا ڈرائنگ روم،

ہر جگہ اپنا سکہ بٹھا دیتے ہیں۔ الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ ان کے پاس ہر وقت محفوظ رہتا ہے۔ خود بڑے اچھے شاعر اور اعلیٰ پایہ کے نقاد ہیں۔ مختصر یہ کہ ذوقی صاحب ایک بہت پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ بے انتہا صلاحیتوں کے باوجود انہوں نے زندگی میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ۱۹۴۷ء تک مختلف کالجوں میں پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد کچھ دماغ میں کجی آگئی تو سیدھے بمبئی پہنچ گئے اور فلموں میں بطور مکالمہ نگار کام کرنا شروع کر دیا۔ پھر جب یہ اندازہ ہوا کہ محض قابلیت اور صلاحیت ہی فلمی زندگی میں کامیابی کی ضامن نہیں ہوتی تو چھوڑ بھاگے۔

خواجہ غلام السیدین میرے زمانے میں یونیورسٹی میں موجود تھے اور مجھ سے کئی سال سینیئر تھے۔ ان کی قابلیت کا لوہا ہر شخص مانتا تھا۔ ان کی تقریر یونین میں بے حد انہماک سے سُنی جاتی۔ تقریر کا فن ان کو ورثے میں ملا تھا۔ ایسے ذہین انسان بہت کم ہوتے ہیں۔ دہلی میں بہ حیثیت سیکریٹری محکمہ تعلیم، مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں کئی سال رہے۔ اس سے قبل بھی حکومت ہند کے تعلیمی ایڈوائزر کی حیثیت سے کام کیا۔ مولانا آزاد کی وفات کے بعد ہندوستان کی حکومت میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، چنانچہ علیحدہ ہو گئے آئندہ کیا کریں گے خدا بہتر جانتا ہے۔ قوم کو آپ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں تقسیم ملک کے بعد وہ سب امیدیں خاک میں مل گئیں۔

محمد اسحٰق خاں میرے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے انگلش ایڈیٹر تھے۔ میگزین کا معیار ان کے دور میں جس قدر اونچا ہوا شاید پھر کسے نصیب نہ ہوا۔ ٹھوس قابلیت کے انسان تھے، مگر زیادہ چمک دمک نہ تھی۔ چہرے بشرے سے سلیم الطبع معلوم ہوتے تھے۔ اُن سے بات کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پروفیسر سے بات ہو رہی ہے۔ بیشتر کریم کلر کی شیروانی پہنتے۔ پبلک لائف میں خصوصاً مسلم لیگی سیاست میں ان کی پوزیشن یوپی کے صفِ اوّل میں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ساری لیگی پارٹی میں اُن سے زیادہ قابل اور مخلص شاید

ہی کوئی دوسرا ہو۔ یوپی اسمبلی میں اسحٰق کی تقریر بہت غور سے سُنی جاتی۔ تقسیم کے بعد اپنے وطن بستی کو نہ چھوڑا۔ اور طرح طرح کی پریشانیاں اٹھائیں، چونکہ ضمیر فروش نہ تھے حالات کا اندازہ کر کے سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ اگر وہ اوروں کی طرح کانگرس میں شریک ہو جاتے تو پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کی صفِ اوّل میں جگہ پاتے۔

میرے زمانے میں جو اصحاب بہ حیثیت وائس پریذیڈنٹ یونین منتخب ہوئے اُن میں خواجہ غلام السیدین کے بعد دوسری شخصیت ڈاکٹر اشرف کی تھی۔ ہر شخص ان کی قابلیت کا معترف تھا۔ خدا نے ذہن رسا دیا تھا۔ ڈبیٹر کی حیثیت سے اس دور میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ یوں اپنا رعب جھاڑنے کے لئے بہت سے لوگ پلیٹ فارم پر آئے، مگر ڈاکٹر اشرف کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

۱۹۲۵ء کی جوبلی میں ہم لوگوں نے کوشش کر کے مہاراجہ الور کو علی گڑھ بلایا جب اُن کا استقبال یونین میں ہوا، تو ڈاکٹر اشرف نے بہ حیثیت وائس پریذیڈنٹ بہت ہی اچھی تقریر کی اور جب یہ کہا کہ میں خود الور کا باشندہ ہوں اور مہاراجہ الور کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ میرے بزرگوں نے ہمیشہ ریاست الور کا نمک کھایا ہے، تو مہاراجہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جادو چل گیا، اور دس روز کے اندر ہی اشرف کی طلبی الور ہوئی اور ایک ہزار روپیہ ماہوار بطور وظیفہ مقرر ہو گیا۔

خواجہ غلام السیدین کا الیکشن اچھا خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ یوں تو سیدین صاحب کو شکست دینا آسان نہ تھا، لیکن پھر بھی بغض معاویہ رکھتے ہوئے لوگ مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ نتیجے میں دونوں امیدواروں کے ووٹ برابر آ گئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنا کاسٹنگ ووٹ کسی کو نہیں دیا، بلکہ عہدے کو دونوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا اور پہلا چانس سیدین کو مل گیا۔ اس سارے ہنگامے میں ایک مزید بات یہ ہوئی کہ ایک بزرگ اصغر علی صاحب دوران الیکشن میں سیدین کی طرف سے

بیٹھنی پیش تھے کسی مسخرے نے ان کی شان میں کچھ اشعار کہے ایک مصرعہ یہ تھا ع

یہ شُتر بھی محمل لیلےٰ کے قابل ہوگیا

مصرعہ ایسا موزوں اور برمحل تھا کہ میں اُسے آج تک نہیں بھولا۔ اصغر علی صاحب دراز قد تھے اور چھوٹی سی داڑھی بھی چہرے پر رکھتے تھے۔

۱۹۲۳ء میں چند لڑکوں کی بے وقوفی سے ایک بڑا ہنگامہ ہوگیا۔ کچھ لڑکے پولیس کے سپاہیوں سے اُلجھ پڑے۔ شام کا وقت تھا۔ اس جھگڑے کی خبر بجلی کی مانند یونیورسٹی میں پھیل گئی کہ جو جہاں بیٹھا تھا بھاگ کھڑا ہوا۔ میں ہمیشہ سے کمزور اور بزدل رہا ہوں۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہوگیا کہ میں بھی مع اور لڑکوں کے پولیس لائن کی طرف دوڑ پڑا۔ سب بے تحاشا بغیر سوچے سمجھے سپاہیوں کی بارکوں کی طرف چلے گئے۔

یکایک ہم پر لاٹھیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ میں چوٹ کھا کر کنکروں کے ڈھیر کے بیچ میں گر پڑا۔ اور لاٹھیوں کا زور زیادہ تر کنکروں پر رک گیا۔ پھر بھی میرے کافی چوٹیں آئیں۔ کئی جگہ سے سر پھٹ گیا۔ آج بھی ٹانکوں کے نشان اس جرأت رندانہ کی گواہی دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پاجامہ اور بنیان پہنے ہوئے پولیس لائن کی طرف دوڑے۔ انہوں نے اور دیگر اسٹاف نے لڑکوں کو قابو میں کیا اور سمجھا بجھا کر واپس لے آئے۔ دس بارہ آدمی داخل شفاخانہ ہوئے۔ مجھے تقریباً تین ہفتے رکنا پڑا۔ بڑے بڑے لوگ ہمیں دیکھنے آتے۔ مرحوم نواب حمید اللہ خاں بھی تشریف لائے۔ نواب مزمل اللہ خاں بھی روزانہ صبح ہسپتال میں ہم لوگوں کو دیکھنے آتے۔ مرغ پلاؤ اور چکن سوپ غذا میں ملتا۔ پھلوں کے تحفے اس قدر آتے کہ ہم لوگ کھا نہ سکتے۔ وقت اچھا کٹ رہا تھا اور ہم لوگ دعائیں مانگتے تھے کہ یہ مرہم پٹی ابھی جاری رہے۔ لیکن تابکے آخر ہسپتال سے نکلنا پڑا۔

۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کے گراؤنڈ میں ایم سی سی سے مقابلہ ہوا۔ یونیورسٹی کی ٹیم منتخب

کرنے کے لئے بہت سے پرانے کھلاڑی پنجاب، پٹیالہ اور دیگر جگہوں سے بلائے گئے۔ حمید الزماں مرحوم اس زمانے میں کرکٹ کلب کے کپتان تھے۔ یہ اصل میں فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ مگر بہرحال کپتان کی حیثیت سے کھلائے گئے۔ ٹیم کا چناؤ ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ ایک یونیورسٹی کی ٹیم کا مقابلہ پیشہ ور کھلاڑیوں سے تھا اور مقابلے پر ٹیم بھی وہ تھی جو اس وقت دنیا کی بہترین ٹیم مانی جاتی تھی۔ ہمارا سارا بھروسہ وزیر علی اور ان کے بھائی نذیر علی پر آگیا تھا۔

گیارہواں کھلاڑی کمیٹی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کو رکھا جائے۔ میاں احسان الحق مرحوم جو کہ اپنے زمانے کے مشہور کھلاڑی رہے تھے۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے انعام الحق کا نام پیش کر دیا۔ ان کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا۔ کرکٹ کے شوقین اور انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ انعام الحق کے نام کو جب اُن کے والد نے خود پیش کیا، تو اس پر خفیہ خفیہ بہت اعتراضات ہوئے۔ مگر بہرحال وہ کھیلے۔

انعام الحق کا عرف ناموٗ تھا اور اسی نام سے اکثر لوگ اُن کو پکارتے۔ جب وہ وکٹ پر کھڑے ہو کر بلا گھماتے، تو اکثر یہ معلوم ہوتا کہ ناموٗ بلے سے نہیں بلکہ بلا ناموٗ سے کھیل رہا ہے۔

افسوس کہ ایم سی سی کے ساتھ اس میچ میں وزیر اور نذیر بھی اچھے کھیل کا مظاہرہ نہ کر سکے اور ہماری ٹیم ایک سو کے قریب رن بنا کر آؤٹ ہوگئی۔ اتفاق کی بات کہ ایم سی سی نے بھی اپنے ٹور کا سب سے کم اسکور علی گڑھ ہی میں کیا۔ اس میچ کو دیکھنے کے لئے پرانے پرانے اولڈ بوائز دور دراز سے سفر کر کے آئے تھے۔ اچھا خاصا ہنگامہ رہا۔

مسعود نامی کو میں نے پہلی مرتبہ کرکٹ فیلڈ میں ہی دیکھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور و معروف پرانے لوگ دیکھنے میں آئے۔

ہمارے ساتھیوں میں ایک صاحب قاسم رضوی بھی تھے ہر قسم کے فساد میں سب سے آگے رہتے۔ اگر کوئی اسٹرائیک ہوتا تو لڑکوں کو اُبھارنے کا کام اُن سے بہتر کوئی دوسرا نہ کر سکتا

تھا۔ لیڈری آپ کا کچھ پیدائشی سا حق تھا۔ کتابوں سے تو رسمی سا واسطہ تھا، البتہ ہر ہنگامے میں پیش پیش رہتے۔ سوتے ہوئے لڑکوں پر گھڑے توڑنے کا کام یہ بہت خوبصورتی سے انجام دیتے۔ بغاوت پسند طبیعت پائی تھی۔ ایسی طبیعت رکھنے والے اکثر سوجھ بوجھ سے ذرا کم ہی کام لیتے ہیں، مگر اکثر بے حد مخلص ہوتے ہیں اور یہی اُن کی خوبی تھی۔

سید قاسم رضوی اب پاکستان میں ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔ اپنے قد سے کچھ کم ہی لمبی ڈاڑھی چہرے پر رکھتے ہیں۔ دیکھئے یہ کب سرد خانے سے برآمد ہوتے ہیں۔ یہ وہی قاسم رضوی ہیں جو مجاہد دکن کے لقب سے مشہور ہیں!

علی گڑھ میں کچھ ایسی شخصیتیں ایسی بھی دیکھنے میں آئیں جنہوں نے آتے ہی چند روز میں اپنی دھاک بٹھا دی۔ عطاء اللہ جان ایسے ہی شخص تھے۔ بہت جلد وہ یونین کے وائس پریزیڈنٹ ہوگئے۔ کیونکہ اچھی تقریر کرسکتے تھے اور انگریزی پر اچھا خاصا کمانڈ تھا۔ وہ قیامِ پاکستان سے قبل صوبہ سرحد کے وزیر بھی ہوگئے تھے۔ کوئی تیس بتیس سال کے بعد ان سے اتفاقیہ اولڈ بوائز کے جلسے میں ملاقات ہوگئی۔ میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔ صورت اور تندرستی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دو چار سال پہلے یونیورسٹی چھوڑی ہے۔

علی گڑھ میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ کوئی صاحب جو وہاں کی زندگی میں کسی خاص ہیئت کے مالک نہ تھے، لیکن الیکشن آتے آتے بیک گراونڈ سے اُبھر آتے۔ ایسے ہی ایک صاحب قاضی غیاث الدین تھے۔ درمیانے قسم کے طالب علم تھے۔ نہاتے بہت کم تھے۔ رات کے کپڑے پہنے ہوئے کالج چلے جاتے۔ کنگھا انہوں نے شاید ہی کبھی استعمال کیا ہو۔ ویسے بھی فلسفے کے طالب علم تھے۔

الیکشن میں یار لوگوں نے مذاق مذاق میں کھڑا کر دیا اور لطف یہ کہ وہ کامیاب ہوگئے۔ ان کی کامیابی کا سہرا امیر الدین احمد قدوائی کے سر تھا جن کے رگ و ریشے میں فتنے پوشیدہ تھے۔ یہ بزرگ اس وقت لاہور میں ہیں اور وکالت فرما رہے ہیں۔ انہوں نے اندر ہی اندر

ریشہ دوانیاں کیں اور ایسے ایسے جال بچھائے کہ ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

قاضی صاحب خاصے بدشکل تھے۔ ان کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ رنگ بھی سیاہ تھا۔ آپ کا قیام صاحب باغ میں تھا۔ کسی دل جلے نے ان کی شان میں ایسا شعر کہا جو زبان زدِ خاص و عام ہوگیا۔ آپ بھی سُن لیجئے:

جب دیا کوئل نے انڈا آشیانِ زاغ میں
تب ہوئے پیدا غیاث الدین صاحب باغ میں

•• اب اُس مقدس ذات کا کچھ حال سُن لیجیے جو یونیورسٹی میں ہر سال آتا ہے اور جسے سرسید ڈے کہتے ہیں۔ اس دن یہاں سرسید کی تصانیف و تالیف وغیرہ کی نمائش ہوتی ہے اور اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تصانیف اور اُن کے خطوط کو زیارتِ عام کی خاطر شوکیسوں میں بڑے اہتمام سے سجا کر رکھ دیتے ہیں۔ اُن کے ساتھ سرسید کا عصا اور اُن کا وہ ڈیسک بھی ہوتا ہے جسے وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے استعمال کرتے تھے ••

الحاج محمد زبیر

میرا وطن صوبہ یوپی کا ایک چھوٹا سا قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ ہے جو ایک زمانے میں بڑے بڑے صوفیا، علماء، اطباء اور شعراء کا مسکن رہ چکا ہے۔ یہاں میرے اسلاف کی پشتہا پشت سے مسلسل سو اسو برس تک طبابت کا فن چلتا رہا، مگر گردشِ ایام نے مجھے ان مقدس راہوں پر چلنے نہ دیا اور میں کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی وطن سے ۳۵ میل دور علی گڑھ آ گیا اور پھر مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کی بنا پر علی گڑھ میرا وطنِ ثانی بن گیا۔ مسلم یونیورسٹی سے میری وابستگی کا آغاز یوں ہوا کہ میرا تقرر ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو بہ حیثیت لا (LAW) لائبریرین جہاں ہو گیا۔ پھر میں یونیورسٹی کی مرکزی لٹن لائبریری سے بھی منسلک ہو گیا۔ دن میں لٹن لائبریری میں کام کرتا تھا اور رات کو لا۔ لائبریری میں۔ اس جزوقتی کام کا مجھے تنخواہ کے علاوہ الاؤنس بھی ملتا تھا۔ یہ صورت ایک عرصے تک قائم رہی۔ پھر اس شعبے سے میرا تعلق منقطع ہو گیا لیکن لٹن لائبریری سے بدستور ۱۹۶۴ء تک وابستہ رہا اور اس بیالیس سال کے طویل عرصے میں میں اسسٹنٹ لائبریرین، لائبریرین اور لیکچرر لائبریری سائنس کے عہدوں پر فائز رہا۔

علی گڑھ سے میرے تعلق کے وقت اس ادارے کو قائم ہوئے ۴۷ برس ہو چکے تھے۔ ۲۰ مئی ۱۸۷۵ء کو سرسید کی کوششوں سے علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم ہوا جس نے جلد ہی ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کر لی۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے ہند کی خدمت میں ایڈریس پیش کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ جو بیج آج ہم بوتے ہیں اس سے ایک ایسا درخت پیدا ہو جس کی شاخیں بڑے درخت

کی مانند زمین میں مضبوط جڑیں پکڑ لیں اور ان سے نئے نئے قوت دار پودے پیدا ہوں اور اس طرح یہ کالج پھیل کر ایک یونیورسٹی بن جائے۔"

کالج کے نیک دل بانیوں کی یہ امیدیں پوری ہونے میں تقریباً ۴۰ برس لگ گئے۔ اور آخر کار ۱۹۲۰ء میں یہ کالج یونیورسٹی کے مرتبے پر پہنچ گیا۔ اولین وائس چانسلر محمد علی محمد خاں (مہاراجہ محمود آباد) پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور رجسٹرار سید سجاد حیدر یلدرم مقرر ہوئے۔

یونیورسٹی کی پہلی چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال منتخب ہوئیں۔ ہندوستان کی تعلیمی و ثقافتی تاریخ میں یہ پہلی خاتون تھیں جنہیں یونیورسٹی کی چانسلر بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور ان کی زیر صدارت یونیورسٹی کا پہلا جلسہ دسمبر ۱۹۲۲ء میں منعقد ہوا۔ اس تاریخی جلسے میں شرکت کے لئے محبان علی گڑھ، ہندوستان کے مختلف گوشوں سے امڈ کر آئے تھے۔ حاضرین کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کی بھی کافی تعداد تھی۔ اسٹریچی ہال میں بیگم صاحب کا خیر مقدم جس جوش و خروش کے ساتھ ہوا اس کا احاطہ میری ناچیز تحریر نہیں کر سکتی۔ ایسے عظیم الشان جلسے میں شرکت کا موقع مجھے اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ میں تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر مسحور ہو گیا تھا۔

بیگم صاحبہ ایک زرنگار کرسی پر تشریف فرما تھیں۔ چہرے پر برقع کا نقاب سایہ کئے ہوئے تھا۔ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ان کے خطبے کا ہر لفظ صاف طور پر سنائی دے رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک انہوں نے خطبہ بزبان اردو ارشاد فرمایا جو شروع سے آخر تک علم نوازی، علم دوستی اور تعلیمی افکار و مسائل سے متعلق زریں خیالات سے معمور تھا۔

یہ جلسہ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں ہوا تھا۔ سب بڑے بڑے جلسے بالعموم اسی عظیم الشان ہال میں ہوتے تھے۔ اس کی اندرونی وسعت پانچ ہزار مربع فٹ کہی جاتی ہے۔

یہ سر جان اسٹریچی سابق گورنر یوپی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی دیواروں پر ان اصحاب کے نام کندہ ہیں جنہوں نے اس ہال کی تعمیر میں چندے دیئے ہیں۔ ان میں مسلم منتظمین کے ساتھ ہندوؤں اور انگریزوں کے نام بھی ہیں، مگر ان سب میں جالندھر ہائی سکول کے ایک غریب مدرس مولوی مراد علی کا نام سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ جنہوں نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے پانچ سو روپے جمع کئے تھے، لیکن نکاح کے وقت خیال آیا کہ اُسے فضول رسموں میں خرچ کرنے کے بجائے قومی کام میں خرچ کرنا بہتر ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی لڑکی کا نکاح صرف شربت اور چھواروں پر کر دیا اور پانچ سو روپے اسٹریچی ہال کی تعمیر کے لئے سر سید کے پاس بھیج دیئے۔

اسٹریچی ہال کے قریب ہی وہ کمرے ہیں جہاں لاء لائبریری تھی اور جن میں قانون کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ یہ کلاسیں ۱۸۹۹ء میں جاری ہوئی تھیں جب ۱۹۲۲ء میں اس کتب خانے سے منسلک ہوا تو لاء پریویس (LAW PREVIOUS) اور فائنل کی کلاسوں میں طلباء کی تعداد تین سو کے قریب تھی اور اسٹاف میں صرف دو جز وقتی لیکچرر، سید علی النقوی اور مولانا عبد الخالق تھے۔ اس زمانے میں ایم اے کے طلباء کو لاء کورس میں داخلے کی اجازت تھی۔ اس طرح ایم اے اور لاء کا کورس صرف دو سال میں مکمل ہو جاتا تھا۔ پھر یہ مدت بڑھا کر تین سال کر دی گئی۔ لیکن اسٹاف کی قلیل ترین تعداد اور طلباء کی کثیر تعداد ہوتے ہوئے بھی شعبے میں پوری طرح ڈسپلن قائم رہتا تھا اور تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ ایم اے او کالج کے آخری سال میں جب قانون کے طلباء کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی کے تحت ہوا، تو تمام طلباء پاس ہو گئے۔ یہ شاندار نتیجہ ان طلباء کا تھا جو ڈبل کورس کئے ہوئے تھے۔ وہ دن میں ایم اے اور رات کو قانون کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

شعبۂ قانون کی خصوصیت کا ایک روشن اور دلکش حصہ لاء لائبریری ہے۔ یہ لائبریری اپنی ندرت کے اعتبار سے پاک و ہند کی لائبریریوں میں امتیازی شان رکھتی ہے۔ یہاں

بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جن پر سید محمود جیسے عظیم قانون داں کے دستخط اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں۔ یہ نادر کتابیں سید محمود ہی کا عطیہ ہیں اور ان ہی سے اس لائبریری کی بنیاد پڑی ہے۔ یہ ۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا جب کسی لائبریری میں ایک ہی موضوع پر کئی ہزار کتابیں جمع ہو جانا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت سے یہاں نصابی کتب کے علاوہ مسلم لا، ہندو لا اور رومن لا وغیرہ کی قیمتی اور مستند کتابیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے تمام ہائی کورٹوں کی وہ اہم رپورٹیں بھی موجود ہیں جن میں ان عدالتوں کے فیصلے شائع ہوتے ہیں۔ اس لائبریری میں ٹرائلس (TRIAL) نامی کتب کا بڑا دلچسپ ذخیرہ بھی موجود ہے، جن میں انگلستان وغیرہ کے سنسنی خیز مقدمات کی روداد بڑے پُرلطف اور عام فہم انداز میں درج ہیں۔ ایسی کتابوں کی بدولت یہ لائبریری غیر قانوندان اصحاب کے لیے بھی پُرکشش ہو گئی ہے۔

یہ لائبریری میری زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری ملازمت کی ابتدا اسی لائبریری سے ہوئی اور کتابوں سے میری محبت کا آغاز بھی اسی کے گہوارے میں ہوا۔ پھر وقت کی روانی کے ساتھ یہ محبت بھی بڑھتی چلی گئی اور جب میں اس شعبے کی لائبریری سے نکل کر یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے وابستہ ہوا، تو کتابوں سے میری محبت کا دائرہ اور وسیع ہو گیا اور آج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ان سے میری الفت و محبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور وہ اب تک جلوت و خلوت اور رنج و راحت میں میرے ساتھ رہی ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی مختلف لائبریریوں سے میں بیالیس برس تک منسلک رہا۔ اس زمانے کے شب و روز مجھے ایک انمول پونجی کی طرح عزیز ہیں۔ اس طویل مدت کی بے شمار یادیں میرے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں، خوش گوار بھی اور ناخوشگوار بھی۔ اس زمانے میں مجھ پر کئی سخت لمحے آئے اور بخیریت گزر گئے۔ میں نے یونیورسٹی سے وابستگی کے دوران میں

پہلے وائس چانسلر سے لے کر بارہویں وائس چانسلر تک کے دور دیکھے۔ میں نے یونیورسٹی کو ابھرتے اور ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھا۔ میری نگاہوں کے سامنے تعلیمی شعبوں اور لائبریری کی توسیع و ترقی ہوئی۔ نئے شعبے کھلے، طبیہ کالج، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، ٹریننگ کالج، زراعتی کالج وغیرہ قائم ہوئے اور لائبریری، تعلیمی شعبوں اور بورڈنگ ہاؤسوں کی عظیم الشان اور سربفلک عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

اس عظیم دارالعلوم میں سعودی عرب کے شاہ سعود، شاہِ ایران، شاہِ افغانستان، مصر کے کرنل جمال ناصر، ترکی کے رہنما رؤف پاشا، فخری پاشا، خالدہ ادیب خانم، ہندوستان کے والیانِ ریاست اور وائسرائے نیز علمائے کرام، سیاسی لیڈروں، ماہرینِ تعلیمات اور اکابر و مشاہیر کی آمد و استقبال کے شاندار نظارے، سلور جوبلی کا بے نظیر جشن اور تقسیم اسناد (کانووکیشن) کے جلسوں کے پروقار اور روح پرور مناظر میں نے دیکھے اور مذہب، سیاست، تعلیمات اور تمدن و معاشرت پر عالمانہ و فاضلانہ اور فصیح و بلیغ تقریریں سنیں۔

طلبا کی یونین کے الیکشن کے معرکے اور ہارے ہوئے امیدواروں کے جنازے نکلتے بھی دیکھے۔ آل انڈیا قسم کے بہترین مشاعرے سنے۔ پھر یونیورسٹی کے علاقے میں مسلم لیگ الیکشن کے مرکز قائم ہوتے دیکھے اور الیکشن کی پُرجوش سرگرمیاں بھی دیکھیں، نیز بعض دل سوز مناظر بھی میرے سامنے سے گزرتے رہے۔ مثلاً یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدہ داروں کی باہمی شکر رنجیاں، رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی کے نتائج، طلبا کی اسٹرائیک، طلبا اور پولیس کے درمیان تصادم، تقسیم ہند کے بعد یونیورسٹی پر مایوسی و اداسی کا تسلط، یونیورسٹی پر ہندوؤں کا حملہ، ڈاکٹر ضیاء الدین (وائس چانسلر) کے مستعفی ہونے کا دلفگار واقعہ اور ان کے انتقال کے بعد سرسید کے پہلو میں ان کے دفن ہونے کا معرکہ۔ میں ان سب کو اپنے زمانے کے افسوسناک اور ناخوشگوار واقعات میں شمار کرتا ہوں۔

میں یونیورسٹی کے پہلے کانووکیشن منعقدہ دسمبر ۱۹۲۲ء سے لے کر اپنی ریٹائرمنٹ

۱۹۶۴ء) تک ہر کانوکیشن میں شریک ہوتا رہا۔ ان جلسوں میں مسلمان، انگریز اور ہندو مشاہیر
اکابر کے نہایت پُر مغز کانوکیشن ایڈریس سُنے۔ یہ ایڈریس پڑھنے کے لئے ایسے اصحاب
مدعو کئے جاتے جو علم و فضل اور عزت و مرتبت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہوں،
یوں تو یونیورسٹی میں ہر جلسہ بڑی شان اور بڑے اہتمام سے منعقد ہوتا تھا، مگر تقسیم اسناد
کے جلسوں کی کچھ شان ہی اور تھی، اُن کی شان و شوکت اور ڈگریوں سے نوازے جانے
والوں کے ہشاش بشاش چہروں کی چمک دمک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان جلسوں میں
شرکت کے لئے مقامی حکام، رؤسا اور دیگر مقامی اصحاب کے علاوہ دور دراز سے بھی
ممبران کورٹ اور قدیم طلبا وغیرہ علی گڑھ آجاتے تھے اور اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھر جاتا تھا۔
جلسے کا آغاز قرآن کریم کے کسی رکوع کی تلاوت سے ہوتا، پرو وائس چانسلر یونیورسٹی
کی سالانہ رپورٹ اور مہمان خصوصی اپنا خطبہ پڑھتے اور کامیاب طلبا کو ڈگریاں دی جاتیں۔
میں نے علامہ اقبالؒ کو پہلے پہل اُس وقت دیکھا تھا جب انہیں مسلم یونیورسٹی کی طرف
سے اعزازی ڈگری دی گئی تھی۔

جس کانوکیشن کی صدارت یونیورسٹی کی چانسلر ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال فرمائیں
اس کی شان و عظمت اور بڑھ جاتی تھی۔ کانوکیشن کے خوبصورت اور پُر شکوہ ڈائس پر ایک
زرنگار کرسی رکھ دی جاتی تھی جس پر وہ متمکن ہوتیں۔ چانسلر کی زریں گون ان کے زیب تن
اور تاجِ شاہی زیب سر ہوتا۔ اُس وقت اُن کی فرماں روائی حاضرین کے دلوں پر
ہوتی تھی۔

ایسے عظیم الشان جلسوں میں شرکت کے لئے لوگوں کی بے تابیاں اور بے قراریاں
بھی میں نے دیکھی ہیں، جو لوگ مدعو ہوتے وہ داخلہ ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے بڑے
بڑے جتن کیا کرتے تھے۔ ان مواقع پر لائبریری اسٹاف کے فرائض بہت بڑھ جاتے
تھے۔ اس لئے کہ کانوکیشن کی تقریبات کا اوّلین مرکز لائبریری ہوتی تھی، جو اسٹریچی ہال

سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔ یہاں مہمانِ خصوصی، یونیورسٹی حکام، ممبرانِ کورٹ اور تدریسی
اسٹاف اپنے اپنے مقررہ لباس، یعنی گون وغیرہ پہنتے تھے۔ پھر سب جلوس کی شکل میں مرتب
ہو کر اسٹریچی ہال کی طرف خراماں خراماں اس سُرخ بانات کی پٹی پر چلتے جو اس مقصد کے
لئے لائبریری سے اسٹریچی ہال تک بچھا دی جاتی تھی۔ جب یہ جلوس اسٹریچی ہال میں داخل
ہوتا، تو حاضرین ایستادہ ہو کر پُر جوش تالیوں کے ساتھ اس کا استقبال کرتے تھے۔ پھر جب
ان تقریبات میں حاضرین کی تعداد اس ہال کی وسعت پر غالب آنے لگی، تو کانوکیشن
وغیرہ کے لئے وسیع پنڈال بنائے جانے لگے۔

میں نے اعلیٰ حضرت نظام دکن، میر عثمان علی خاں، فرمانروایانِ بھوپال ہز ہائی نس
نواب سلطان جہاں بیگم اور ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں، نواب صاحب بہاولپور،
نواب صاحب رام پور، مہاراجہ الور، سر آغا خاں، وائسرایانِ ہند لارڈ لنلتھگو، لارڈ ریڈنگ
لارڈ ارون، لارڈ ولنگڈن، یوپی کے گورنر سر ولیم میرس کے خیر مقدم اور ایڈریس پیش کرنے
کے جو رنگ و اختشام دیکھے ویسے ہی تقسیم ہند کے بعد مسٹر راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر راجندر
پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسز سروجنی نائیڈو کی یونیورسٹی میں
تشریف آوری کے وقت دیکھنے میں آئے اور انہیں دیکھ کر قرآن کریم کی آیت

تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ذہن میں آگئی۔

اب میں سائنس کالج کے سنگِ بنیاد رکھنے، نصر اللہ ہوسٹل کے افتتاح اور
پانچویں کانوکیشن کا آنکھوں دیکھا حال اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔ یہ تینوں تقریبات
۱۴، ۱۵ نومبر ۱۹۲۶ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے عہد وائس چانسلری میں ہوئیں۔
ان میں شرکت کے لئے دور اور نزدیک سے بڑی تعداد میں مہمان آئے تھے۔ یوں تو
ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کانوکیشن کی صدارت کے لئے تشریف لاتی ہی رہتی تھیں،
لیکن اس بار اُن کی تشریف آوری کی ایک غرض نصر اللہ ہوسٹل کا افتتاح کرنا بھی تھا۔

جو اُن کے صاحبزادے نصراللہ خاں مرحوم کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اُن کے ہمراہ اعلیٰ حضرت نواب حمیداللہ خاں بھی تھے۔ ان دونوں جلیل القدر ہستیوں کا بڑا شاہانہ استقبال ہوا۔ اسٹیشن سے یونیورسٹی تک راستوں کو جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت کی آمد آمد نے اُن کی اِس مادرِ درسگاہ کی رونق دوبالا کر دی تھی۔ وہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۵ء تک ایم اے او کالج کے طالب علم رہے۔ ۱۹۲۶ء میں ہر ہائی نس نے حکومت سے دستبردار ہو کر بھوپال کی سلطنت انہیں تفویض کر دی تھی۔ اس موقع پر جوبلی گراؤنڈ میں ایک شاندار پنڈال تعمیر کیا گیا جس میں پانچواں کانوکیشن ہر ہائی نس چانسلر کے زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ یہیں اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔ نواب صاحب نے جوابی تقریر فرمائی اور دو لاکھ روپے عطیہ دینے کا اعلان فرمایا۔ اس عظیم الشان تقریب کے بعد اعلیٰ حضرت نے سائنس کالج کا سنگِ بنیاد نصب کیا۔ اس حکمران نے ایک دن طلبا کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلا اور کالج میں اپنے کرکٹ کپتان ہونے کی یاد زندہ کر دی۔

سائنس کالج کا سنگِ بنیاد رکھنا ایک عہد آفریں واقعہ تھا۔ یونیورسٹی میں سائنس کے علوم کی تعلیم تو ہوتی ہی تھی، مگر اس کے لئے کوئی مخصوص عمارت نہ بنی تھی۔ اس مبارک سنگِ بنیاد پر جو شاندار عمارت تعمیر ہوئی، اُس میں کلاسوں اور لائبریریوں کے لئے وسیع کمرے بنے اور اتنی طویل و عریض لیباریٹریاں تعمیر ہوئیں کہ اُن جیسی لیبارٹریاں اس وقت تک ہندوستان کے کسی اور ادارے میں نہ بنی تھیں۔

ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال جب نصراللہ ہوسٹل کا افتتاح کرنے تشریف لے گئیں، تو وہاں لوگوں نے بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا، وہ بڑا پُر اثر منظر تھا۔ ایک ماں اپنے مرحوم بیٹے کی یادگار کا افتتاح کرنے آئی تھیں۔ پہلے ان کی خدمت میں ایڈریس پیش ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے افتتاح کی رسم ادا فرمائی۔ ایڈریس کا جو فاضلانہ جواب انہوں نے دیا اس کے یہ چار ٹکڑے تعلیمی تاریخ کے ہمیشہ روشن باب رہیں گے۔

ہر ہائی نس نے ارشاد فرمایا:

"حضرات میں اس موقع پر ایک خاص امر کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتی ہوں کہ اینٹ اور گارے چونے اور پتھر کی رفیع الشان عمارتیں بلاشبہ جاذبِ نظر ہوتی ہیں لیکن ان کی حقیقی شان اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ان کے اندر رکھے ہوئے کاموں کے شاندار نتائج ظاہر ہوں۔ دنیا کی کوئی عمارت حجرۂ نبوی کی خام دیوار اور نیچی چھت سے زیادہ شاندار نہیں ہے۔ یہ وہ مقدس عمارت تھی جہاں سے علم و فضل کے دریا موجزن ہوئے اور اُن سے وہ برقی قوت حاصل ہوئی کہ بحر و بر منور ہو گیا" ۲۔ "مجھے عمر کی ستروں منزل پر پہنچ کر سب سے بڑی تمنا اور سب سے آرزو یہ ہی ہے کہ اس دارالعلوم کو نہ صرف ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ممتاز دیکھوں بلکہ وہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں بھی خاص امتیاز رکھتی ہو"

۳۔ "میں اس مسرت کو بیان نہیں کر سکتی جو مجھے کل یہاں پہنچ کر اس خبر سے حاصل ہوئی کہ مولوی سبحان اللہ خاں صاحب رئیس گورکھپور نے اپنا مشہور و نادر کتب خانہ یونیورسٹی کو عطا کر دیا ہے۔ میں ان کا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں"۔

۴۔ "حضرات یونیورسٹی شاندار ایوانوں، سر بفلک عمارتوں اور رفیع الشان بورڈنگ ہاؤسوں کا نام نہیں، نہ یونیورسٹی ہر سال ہزاروں طلبا کو ڈگری ہولڈر بنانے کے کارخانے کو کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس کو مطلع العلوم ہونا چاہیے جس سے علم کا نور دنیا میں پھیلے اور جہالت کی ظلمت و تاریکی دور ہو"۔

میں نے یونیورسٹی سے اپنی وابستگی کے دوران میں جتنے جلسے دیکھے ان میں جشنِ جوبلی سب پر سبقت لے گیا تھا۔ اس سے پہلے کسی جلسے کے لئے نہ ایسا اہتمام ہوا تھا اور نہ اس میں شرکت کے لئے اتنے مہمان آئے تھے۔ اس جشن کی تقریبات

کا سلسلہ ۵ ۲ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ جاری رہا۔ یہ دن اس دارالعلوم کی تاریخ کے وہ مبارک دن تھے جب سرسید اور ان کے مخلص رفقائے کار کی بے لوث خدمات کا شاہکار مسلم یونیورسٹی بڑے بڑے مصائب سے بخیر و خوبی گزرتی ہوئی پچاس برس کی عمر کو پہنچی تھی۔ اس نے نہ صرف مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا، بلکہ تمام ہندوستان کی تمام قوموں کے لئے اس کا وجود نفع بخش ثابت ہوا تھا۔ برصغیر میں یہ پہلی درسگاہ ہے۔ جس نے اسلامی علوم کے تعمیری رشتے دنیوی علوم و فنون سے قائم کرائے اور اس کے دامنِ فیض کے پروردہ دینی اور قومی زندگی کے لئے چراغِ راہ بنے۔ ان عہد آفرین کارناموں نے اس کی ہردلعزیزی اتنی عام کر دی تھی کہ اس کے پچاس سالہ جشن میں شرکت کے لئے یونیورسٹی کورٹ کے ممبران اولڈ بوائز کے علاوہ ہر مکتبۂ فکر اور ہر مذہب و ملت کے اکابر و مشاہیرِ ہند اور بیرونِ ہند کے گوشوں سے کھنچ کھنچ کر علم کی اس بستی میں جمع ہو گئے تھے۔

اس تاریخی اجتماع میں وزیر تعلیم افغانستان اور ارکانِ وزارت، آکسفورڈ اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نمائندے، مرکزی و صوبائی حکومتوں کے اعلیٰ عہدیدار اور متعدد ریاستوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ مہمانوں کی تعداد سات ہزار کے قریب تھی۔ اتنے بڑے اجتماع کے لئے ایک نہایت وسیع اور بے حد خوب صورت پنڈال بنایا گیا۔ مہمانوں کے لئے اتنے خیمے نصب ہوئے کہ یہ مدینۃ العلم مدینۃ الخیام نظر آنے لگا۔

جوبلی کے جلسے کے صدر مہاراجہ صاحب ریاست الور تھے جو انگریزوں کے معتوب اور مولانا محمد علی کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ مہاراجہ صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں انہوں نے نہایت بلند پایہ تقریر کی ۲۵ ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا اور یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم کو بیرونِ ہند تعلیم کے لئے وظیفہ عنایت فرمایا۔ عطیے کی رقم میں سے

۲۵ ہزار روپے نقد دیئے اور آٹھ ہزار روپے سالانہ شعبہ دینیات کے لئے پانچ سال تک دینے کا وعدہ کیا۔ مہاراجہ نے اول الذکر رقم دیتے وقت ارشاد فرمایا: "میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس الفت و محبت کی عبادت گاہ کے لئے جس کا پیشوا آپ کا رہنمائے اعظم سرسید احمد خاں تھا، میری جیبِ خاص سے ۲۵ ہزار روپے کی ایک تشکر آمیز لیکن حقیر رقم نذر کے طور پر قبول فرمائیں گے۔"

جوبلی کے متعلق یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ جشن مالی اور معنوی فائدوں سے خالی نہیں رہا۔ تقریباً ۵ لاکھ روپے کے عطیات نقد اور وعدوں کی شکل میں ملے، جو اس زمانے میں ایک بڑی گرانقدر رقم تھی۔ معنوی اعتبار سے جو فائدے پہنچے ان میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علی گڑھ تحریک کو حیاتِ نو مل گئی۔ اس مبارک اجتماع نے علی گڑھ کی محمود روایات اور اس کے بانی کے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے محبان و کارکنانِ یونیورسٹی کو نئے ولولے اور تازہ حوصلے دیئے اور نہ صرف یونیورسٹی کی رفعت، مرکزیت اور افادیت کا شہرہ ہندوستان سے یورپ تک پہنچ گیا، بلکہ بڑے بڑے جلیل القدر اربابِ علم کے ذہنی اور علمی رابطے علی گڑھ سے قائم ہو گئے۔

اس تقریبِ سعید میں مسلمانوں کی وسعتِ نظری اور فراخ دلی کا یہ اعلیٰ نمونہ بھی سامنے آیا کہ ان کی عظیم درسگاہ کے تاریخی جشن میں ایک غیر مسلم فرمانروا بہ حیثیت مہمانِ خصوصی رونق افروز ہوئے۔ مہاراجہ کی طویل تقریر میں نے آج سے پچاس برس پہلے سنی تھی لیکن اس کی بازگشت اب بھی میرے کانوں میں سنائی دے رہی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "میں نے اس مقصد کے لئے یہ سفر طے نہیں کیا کہ آپ کے اعلیٰ نصب العین کے لئے عطیات کا اعلان کر کے آپ کی ستائش کا مستحق بنوں۔ میں اپنی اس امداد کا اعلان تار کے ذریعے بھی کر سکتا تھا۔ دراصل یہ آپ کی اس مبارک و مسعود دعوت کی حسین طلب تھی جو جوبلی میں میری شرکت کی موجب ہوئی!"

۲۔ "اظہارِ خیالات کا ذریعہ الفاظ ہوا کرتے ہیں، لہٰذا اے معزز احباب یہ محض الفاظ ہی نہیں تھے جو مجھے یہاں کھینچ لائے ہیں، بلکہ یہ وہ رُوح تھی جو اُن کے اندر گردش کر رہی تھی جس نے میرے دل کے نازک تاروں کو متحرک کر کے تعمیلِ حکم کا ولولہ پیدا کیا۔"

۳۔ "حضرات میں نے اس موضوع پر قدرے طوالت کے ساتھ صرف اس وجہ سے گفتگو کی ہے کہ میں اسی کو آپ کے اولوالعزم رہنما سرسید احمد خاں کا مطمعِ نظر تصور کرتا ہوں۔ انہوں نے ایک ایسی دارالضرب کی بنیاد ڈالی جہاں فطرتِ انسانی کی دھات کو اسلام کی بھٹی میں پگھلا کر ڈھالا جاتا ہے۔ اسلام صداقت ہے اور یہاں سے وہ شمشیرِ آب دار تیار ہو کر نکلنی چاہیے جو جہالت کے بندھنوں کو کاٹ کر پھینک دے تاکہ وہ اقوام کے اسلحہ خانے میں اس شان سے اپنا موزوں مرتبہ حاصل کرے کہ سب اُسے محبت و عظمت کی نظروں سے دیکھیں۔"

۴۔ "میں اس مقام پر ایک طاہرِ منزل نشین کی طرح وارد نہیں ہوا ہوں، پانی کی رَو کی طرح آیا اور ہوا کے جھونکے کی طرح جا رہا ہوں۔ آپ نے مجھے اعزاز بخشا، میرا شاندار استقبال کیا اور آخر میں آپ نے نقرئی کشتی میں مجھے ایڈریس پیش کیا۔ ان سب کا مجھے بہت کچھ احساس ہے اور میں ان کی قدر کرتا ہوں، لیکن آپ نے ان سے بدرجہا بہتر ایک عزت بخشی ہے جسے میں سب سے بیش بہا نعمت سمجھتا ہوں وہ آپ کا پُرشوق اور لبریزِ جوشِ الفت ہے۔"

اب اُس مقدس دن کا کچھ حال سن لیجئے جو یونیورسٹی میں ہر سال آتا ہے اور جسے سرسید ڈے کہتے ہیں۔ اس کا ذکر مجھے اس لئے بھی کرنا ہے کہ لائبریری سے اس کا گہرا تعلق ہے، اس دن یہاں سرسید کی تصانیف و تالیف وغیرہ کی نمائش ہوتی ہے اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تصانیف اور اُن کے خطوط کو زیارتِ عام کی خاطر شوکیسوں میں بڑے اہتمام سے سجا کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ سرسید کا عصا اور ان کا وہ ڈیسک بھی ہوتا ہے جسے وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

ان انمول یادگاروں کی زیارت کے لئے صبح سے شام تک لوگ لائبریری آتے رہتے ہیں۔ میں نے یہ دیکھا کہ سرسید کے اس خط کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا جو انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی کو ان کے مسدس کے بارے میں اپنے دستِ خاص سے ۱۸۷۹ء میں لکھا تھا، یہ مسدس لکھنے کی تحریک سرسید ہی نے کی تھی۔ جب یہ شائع ہوا تو انہوں نے اپنے جوشِ مسرت کا اس خط میں یوں اظہار کیا تھا کہ "جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو دنیا سے کیا لایا، تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔"

سرسید کی برسی کا یہ دن اساتذہ اور طلبا بڑے عقیدت و احترام سے مناتے ہیں۔ اس دن چھٹی ہوتی ہے، مگر صبح سے شام تک بڑی مشغولیت رہتی ہے۔ اس روز صبح کو سرسید کے مزار پر قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اساتذہ اور طلبا کے ایک جلسے میں ان کی حیاتِ مقدسہ پر تقریریں ہوتی ہیں۔ رات کو دعوتِ طعام ہوتی ہے۔ اسٹریچی ہال سے وکٹوریہ گیٹ تک اور مسجد سے لٹن لائبریری کی پرانی عمارت تک سفید فرش بچھا دیئے جاتے ہیں اور یہ علاقہ روشنیوں سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی اور اس کے تمام متعلقہ اداروں کے مسلم اور غیر مسلم اساتذہ، طلبا، طالبات اور مہمان وغیرہ کوئی پانچ ہزار کے لگ بھگ فرش پر طعام تناول کرتے ہیں۔ اخوت، یکجہتی اور مہمان نوازی کا عجب دل کش منظر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں پاک و ہند کی کسی یونیورسٹی میں اس شان اور اس نوع کی دعوت کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ یہ روایت صرف علی گڑھ کا حصہ ہے۔ اس اجتماع کی کیفیت اور دعوت کے مزے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میں نے ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک بارہ وائس چانسلروں کے عہد دیکھے، ان میں مہاراجہ محمد علی محمد خاں (محمود آباد)، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر محمد مزمل اللہ خاں، سر سید راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، سر شاہ محمد سلیمان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (دورِ ثانی)، سید زاہد حسین، نواب محمد اسماعیل خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید بشیر حسین زیدی اور

مسز بدرالدین طیب جی شامل ہیں۔

شروع کے تین وائس چانسلروں نے اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ اور سر شاہ سلیمان نہ صرف اس معاوضہ سے بے نیاز رہے، بلکہ انہوں نے بے مثل ایثار سے اپنے فرائض انجام دیئے وہ دوبار اس عہدے پر فائز ہوئے۔ ایک بار الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور دوسری بار فیڈرل کورٹ دہلی کے جج ہونے کے دوران میں اس فرض کو انجام دینے کی خاطر وہ دو دن ہفتے اور اتوار کو اپنے ذاتی صرفے سے علی گڑھ تشریف لایا کرتے تھے۔ وائس چانسلر کے دفتر کے ایک کمرے میں قیام فرماتے اور اپنے لئے کھانا یونیورسٹی ڈائننگ ہال سے منگواتے جس کی قیمت وہ خود ادا کرتے تھے۔

ان وائس چانسلروں کی صف میں نواب محمد مزمل اللہ خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ وہ سرسید ہی کے زمانے سے علی گڑھ تحریک کے سرگرم کارکن رہے تھے۔ عمر کے لحاظ سے ان میں سب سے بڑے نواب صاحب تھے اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر صاحب تھے۔ نواب صاحب کو چھتیس برس کی عمر ہی میں ایم اے او کالج کے تیسرے سیکرٹری نواب محسن الملک کے جوائنٹ سیکرٹری ہونے کا اعزاز مل گیا تھا۔ اُن کی ذات پر سیکرٹری کو جو اعتماد اور بھروسہ تھا اور ان کے درمیان جو مخلصانہ تعلقات تھے اُن کا اندازہ نواب محمد مزمل اللہ خاں کے ایک خط سے ہوتا ہے وہ رقم طراز ہیں:

"نواب محسن الملک مرحوم کے اور میرے تعلقات کچھ تو ان کے دل میں تھے جو زیر زمین دفن ہیں، کچھ میرے دل میں ہیں جو سربمہر ہیں اور کچھ پراگندہ اوراق میں منتشر ہیں۔"

نواب صاحب کا پُر وقار چہرہ اس وقت بھی میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔ وہ بھیکم پور کے مشہور شیروانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ میں اپنی شاندار رہائش گاہ "منزل پیلیس" تعمیر کرائی تھی جہاں ان کی علم دوستی کی یادگار ان کا کتب خانہ آج بھی تشنگانِ علوم کو سیراب کر رہا ہے۔ اس میں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی آٹھ ہزار کتابیں ہیں۔

اکثر کتابوں کے مندرجات کے حوالے انہیں خوب یاد تھے۔ انہوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم پائی تھی اور انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ فارسی کے اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا یہ علم نواز شخصیت ۲۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بڑے قابل بیرسٹر، بہت اچھے مقرر اور نہایت مخلص آدمی تھے۔ برسوں گھر سے باہر لندن میں رہے۔ وہاں کے معصیت زدہ ماحول میں نہایت پاکیزہ زندگی بسر کی اور اپنا باورچی ہمیشہ ساتھ رکھا۔ سرسید سے اپنے دلی تعلق کو قائم و دائم رکھنے کے لئے اپنی بیٹی اُن کے پوتے سر سید راس مسعود کو بیاہ دی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی کوٹھی کے قریب اپنے والد نواب غلام احمد خاں کی یاد میں مدرسۂ نابینا قائم کیا۔ بالآخر اس شعلہ بیان مقرر کی طاقت لسانی فالج نے سلب کر لی۔ میں نے ان کی تقریریں سنیں اور پھر اُن کی بے زبانی بھی دیکھی۔ ایک لفظ بولنے کی بھی قدرت نہ رہی تھی۔ پھر اسی موذی مرض نے ان کا تعلق اس دنیا سے منقطع کر دیا۔ ان کی لائق و فائق اولاد نے ان کا نہایت حسین مقبرہ بنوایا، وہ جتنی پاکیزہ اور نفیس زندگی بسر کیا کرتے تھے ویسا ہی خوب صورت ان کا مقبرہ ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے، اس لئے کہ ان کے بھائی سے میری پھوپھی زاد بہن بیاہی تھیں۔ وہ فنانی الکالج تھے، موصوف لیکچرر، پروفیسر، پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر رہے، مگر ہر حال میں ان کا مزاج غصے سے نا آشنا رہا۔ وہ قوم اور کالج کی فلاح و بہبود کی خاطر کچھ بے ضابطگیاں کر لینا بھی جائز سمجھتے تھے۔ درحقیقت ان کی تعلیمی پالیسی کا مقصد مسلم عوام کو تعلیم یافتہ بنانا تھا۔ اس جذبے میں قوت و شدت کلکتہ یونیورسٹی کمیشن سے وابستگی کے بعد اور بڑھ گئی۔ ۱۹۱۷ء میں وہ اس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ یہاں انہیں بنگالی ماہرین تعلیم کے نظریات اور منصوبے جاننے کے مواقع ملے۔ یہ ماہرین ہر بنگالی ہندو کو ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے لئے مواقع فراہم کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھتے تھے۔ اس نظریے کو ڈاکٹر صاحب نے اپنایا اور

جب اختیارات ان کے ہاتھ میں آئے تو اُسے عملی جامہ پہنا دیا اور ہائی اسکول کے امتحانات میں شریک ہونے کے لئے ہر خاص و عام کو اجازت دے دی، اس اجازت سے ہزاروں مسلم طلبا کی قسمت جاگ اٹھی اور بالخصوص غریب اور نادار مگر ذہین طلبا کے لئے تو یہ رحمت ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب میری بڑی قدر افزائی فرمایا کرتے تھے، جب میری کوئی تصنیف ان کی خدمت میں پہنچتی، تو وہ اپنے دستِ خاص کی تحریر کے ذریعے اپنی رائے عالی سے مجھے مطلع فرماتے۔ وائس چانسلری کے زمانے میں میرا ایک کتابچہ "اُردو نثر کا تاریخی سفر" جب ان کے ملاحظے میں آیا، تو اس کے بارے میں یہ تحریر فرمایا کہ! "واقعی دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے۔"

وائس چانسلری کے بعد گورنر بہار اور صدر بھارت رہنے کے زمانے میں بھی اُن کی قدر افزائیاں جاری رہیں، میری کتاب "اسلامی کتب خانے" ملاحظہ فرما کر انہوں نے یہ کرم نامہ مجھے ارسال فرمایا:

"مجتبیٰ زبیر صاحب!

نوازش نامہ ملا! یاد فرمائی کا شکریہ، آپ کی کتاب "اسلامی کتب خانے" کا نسخہ بھی ملا۔ ماشاء اللہ آپ نے خوب دادِ تحقیق دی ہے اور خاصا مواد یکجا کر دیا ہے۔ کبھی دہلی تشریف لائیں تو ضرور ملئے، لیکن اگر پہلے سے لکھ دیجئے گا، تو وقت مقرر ہو جائے گا کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ احباب تشریف لاتے ہیں اور میں کسی اور کام میں مبتلا ہوتا ہوں، تو وہ مایوس ہوتے ہیں اور میں شرمندہ۔ خدا کرے آپ خوش اور اچھے ہوں۔ والسلام"

مخلص

ذاکر حسین

ڈاکٹر صاحب نے مجھے ملاقات کی دعوت دیتے ہوئے جیسے انکسار آمیز الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کروڑوں انسانوں کے سربراہ کا یہ انکسار ان کی حقیقی بڑائی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے حُسنِ اخلاق اور انکسار نے ان کے عہدے کی بڑائی کو دوبالا کر دیا تھا۔ اب اُن جیسے نیک دل انسان دیکھنے کو آنکھیں ترستی رہتی ہیں۔

کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کی نیک نفسی اور سادگی کا ایک واقعہ بھی سُن لیجئے، ایک دن علی الصبح میرے گھر کے دروازے پر کھٹکا ہوا، میں نے باہر آکر دیکھا کہ زیدی صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ عظمت الٰہی زبیری صاحب سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی سے ملنے تشریف لائے تھے، جو پاکستان سے آکر میرے ہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اس ملاقات کے دوران میں انہوں نے عظمت صاحب اور مجھے چائے پر وائس چانسلر ہاؤس آنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت وہ بذریعہ تحریر بھی دے سکتے تھے، لیکن ان کی نیک نفسی انہیں میرے غریب خانے تک لے آئی۔

عظمت الٰہی زبیری صاحب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار سید سجاد حیدر یلدرم کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، پھر اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث رجسٹرار ہو گئے، انہوں نے یہ خدمت مسلسل اٹھارہ برس تک انجام دی اور اپنی ضابطہ پسندی، میانہ روی اور غیر جانبداری کی وجہ سے مرنجاں و مرنج رہے۔ ان کی خدمات کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے زمانے میں امتحانات کا انتہائی نازک اور اہم کام اتنے عزم و احتیاط اور دیانت کے ساتھ کیا گیا کہ اس طویل مدت میں نہ کوئی امتحان کا پرچہ وقتِ مقررہ سے پہلے کبھی پردۂ اخفا سے باہر آیا اور نہ کسی خیانت و بدعنوانی کی کوئی صورت کبھی نمودار ہوئی۔

"علی گڑھ کے وائس چانسلری کے زمانے میں وہ (سر شاہ محمد سلیمان) دلی سے ہر ہفتے میں دو دن علی گڑھ تشریف لاتے اور اپنے سفر اور قیام کے مصارف کا بار خود اُٹھاتے، حتیٰ کہ ڈائننگ ہال کے کھانے کے دام تک اپنی جیب سے دیتے اور رات کو ہوسٹل کے کسی کمرے میں آرام کر لیتے تھے"

پروفیسر ضیا احمد بدایونی

وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے کہنے کو تو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا، مگر کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے، جب میں اپنے وطن بدایوں کے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ اُس زمانے میں میرے چند عزیز ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ یہ لوگ جب تعطیل میں گھر آتے، تو علی گڑھ کی خوشگوار یادیں، سوغات میں لاتے اور ہم لوگوں کو وہاں کے واقعات سناتے۔ انہی میں ایک صاحب تھے جو مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے۔ نہایت متین و مہذب، سنجیدہ و شائستہ، دیندار اور اخلاص شعار۔ وہ جب مجھ سے ملتے تھے، تو کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ طلبا کا رکھ رکھاؤ، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے میل جول، انگریز پروفیسروں کا بے تکلف لڑکوں کے کمروں میں آنا۔ اُن کی مشکلات کو سنتا اور دکھ درد میں ان کا ہاتھ بٹانا، بیماری میں اپنی کوٹھی سے پرہیزی کھانا پکوا کر خود لانا اور اپنے سامنے پیار اور شفقت سے کھلانا، کالج کے طلبا کو اپنے یہاں چائے پر بلانا، ان کا اور ان کی لیڈی کا کمال محبت سے پذیرائی کرنا اور چلتے وقت برآمدے تک مشایعت کر جانا، غرض ایک عجیب اپنائیت کی فضا تھی جس کی نظیر کسی دوسری درسگاہ میں نہیں ملتی تھی۔ عزیز موصوف جب تک یہ باتیں کرتے میں ہمہ تن گوش بن کر سنتا اور دل ہی دل میں علی گڑھ دیکھنے کا شوق پرورش پاتا۔ سچ پوچھئے تو علی گڑھ میرے خوابوں کی بستی بن گیا تھا۔

کیا خبر تھی کہ یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ اختیار کرے گا اور چند سال بعد مجھے استاد کی حیثیت سے اسی مرکز علم و ادب میں آنا ہوگا جو میرے خوابوں کی بستی تھا۔ ہوا یوں کہ

جب میں الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنے اور پھر وہاں فارسی ادب میں ریسرچ کر کے دو سال گزارنے کے بعد وطن آیا تو ایک دن میرے ایک محترم کرم فرمانے جو مجھ سے بے حد خلوص رکھتے تھے فرمایا کہ "قریشی صاحب آئے ہوئے ہیں وہ تمہیں یاد کرتے تھے۔" یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ اب تک مجھے قریشی صاحب سے تعارف کی عزت حاصل نہ تھی۔ بہرحال میں ان کی خدمت میں گیا، بڑے تپاک سے پیش آئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا کہ "ہمارے یہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے آپ آجائیں تو اچھا ہے۔" میں نے موصوف کی پیشکش کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور علی گڑھ جا کر مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قریشی صاحب کون بزرگ تھے:

پروفیسر عبدالمجید قریشی کا وطن تو پنجاب تھا، لیکن وہ علی گڑھ میں طالب علمی اور ملازمت کا طویل زمانہ گزار چکے تھے اور نہ صرف یہ، بلکہ وہاں کی زندگی میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اور علی گڑھ لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ مشہور تھا کہ چکرورتی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو پیدا کیا، ڈاکٹر ضیاء الدین نے قریشی کو اور قریشی نے حافظ عثمان کو۔ یہ سب حضرات ریاضی میں امتیازی مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ان کو فلسفہ و ادب سے بھی خاصا ذوق تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ بیک وقت ایک بالغ نظر مدبر بھی تھے اور پاکیزہ جذبات کا پیکر بھی۔ مولانا روم نے جو کہا ہے کہ ع

کار پاکاں روشنی و گرمی است

خدا نے دماغ کی روشنی اور دل کی گرمی دونوں موصوف کی ذات کے اندر جمع کر دی تھیں۔ کشیدہ قامت، بارعب چہرہ اور شاندار مونچھیں، یہ تھے قریشی صاحب جو میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوئے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ لڑکوں نے ڈائننگ ہال کے انتظام سے ناراض ہو کر اسٹرائک کر دی اور تمام ارباب حل و عقد اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر

رہے۔ مگر قریشی صاحب نے جو سمجھتے تھے کہ کہاں نرمی کا محل ہے اور کہاں گرمی کا، منٹوں میں اپنے ناخن تدبیر سے اس عقدے کو یوں حل کر دیا کہ سب دنگ رہ گئے۔

علی گڑھ میں بڑے عظیم الشان مشاعرے ہوئے جن کا سہرا دو شخصیتوں کے سر رہتا۔ قریشی صاحب اپنی وجاہت سے طلبہ کے جوش و خروش کا بار سنبھالتے اور مولانا احسن مارہروی نازک مزاج شعراء کی خاطر و مدارت کر کے کام نکالتے۔ میں نے ایسے افراد بہت کم دیکھے ہیں جن سے طلباء ایک طرف ڈرتے ہوں اور دوسری طرف ان کا دم بھی بھرتے ہوں اور یہ بات قریشی صاحب میں پائی۔

جس کالج میں پہلی بار میرا تقرر ہوا، اس کے پرنسپل قریشی صاحب ہی تھے۔ دو کلاسیں یونیورسٹی کی اور دو اسکول کی ملا کر اس انٹرمیڈیٹ کالج کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ یونیورسٹی اور اسکول کا دائرۂ عمل اس سے الگ تھا۔ کالج کے اساتذہ میں چند اصحاب ایسے تھے جن کے علمی اکتسابات اور مخلصانہ تعلقات کی یاد اب تک دل میں جاگزیں ہے۔ ان میں مشتاق احمد صاحب خلف نواب وقار الملک مرحوم، عبدالشکور صاحب، ڈاکٹر ناظم صاحب، محمد حاذق صاحب اور شیخ علی جواد صاحب مرحوم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

عربی کی کہاوت ہے "لِکُلِّ داخِلٍ دَھْشَۃٌ" یعنی ہر نو وارد کو گھبراہٹ کا سامنا ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ علی گڑھ کے طالب علموں کی شرارتوں کے قصے سن چکا تھا، تاہم کلاس لینا ضروری تھا۔ شروع شروع میں بعض طلباء نے شوخ طبعی دکھائی، مگر جلد ہی ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہاں دال نہ گلے گی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کالج میں اور کالج کے بعد یونیورسٹی میں ان کا احترام اور میری شفقت ضرب المثل بن گئی۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ علی گڑھ کے طویل زمانۂ قیام میں ارباب اختیار کا معتمد علیہ، اپنے رفقائے کار میں مقبول اور اپنے شاگردوں میں محترم رہا۔ بعد کو قریشی صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا کہ علی گڑھ کے طلباء اپنے اساتذہ کا صحیح جائزہ لینا جانتے ہیں، اگر کوئی استاد نالائق ہوتا ہے یا خواہ مخواہ رعب جماتا ہے یا کام کرنا نہیں

چاہتا، تو وہ اس کو چٹکیوں میں اڑا دیتے تھے، لیکن اگر کوئی ٹھکانے کا آدمی پاتے ہیں، تو اس کی دل سے عزت کرتے ہیں۔

میں جب علی گڑھ پہنچا ہوں، تو وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے۔ وہ ایک شکیل و جمیل انسان تھے اور عین مین انگریز معلوم ہوتے تھے، بلکہ انگریز کا تو صرف رنگ گورا ہوتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب ہر طرح پیکرِ جمال تھے۔ بچپن سے ان کی قابلیت، علمیت، مذہبیت، دیانت داری اور حق پسندی کے چرچے کانوں میں پڑے تھے۔ مذہب سے لگاؤ تو ہمیشہ سے تھا، لیکن آخر میں تو مذہب ان کی پوری زندگی پر چھا گیا تھا۔ وہ قوم اور یونیورسٹی کی خدمت کی سچی لگن رکھتے تھے اور دونوں کو بامِ عروج پر پہنچانے کے آرزومند تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرحوم میں ضد اور اپنی رائے پر اصرار تھا مگر میری ناقص رائے میں ہر اصول پرست اور حق پسند کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرحوم فالج کے حملے سے صاحبِ فراش اور نشست و برخاست سے معذور تھے۔ ۱۹۲۷ء میں اچانک سنا کہ صاحبزادہ صاحب نے ایک زبردست پمفلٹ چھپوا کر تمام ممبرانِ کورٹ کو اور دوسرے ذمہ دار اعیانِ قوم کو بھیجا ہے۔ پمفلٹ کیا تھا گویا بم کا گولا تھا جس نے علی گڑھ کی ساکن فضا میں قیامت کی ہلچل ڈال دی تھی۔ جو تھا تصویرِ حیرت بنا ہوا تھا، ہر ایک کی زبان پر یہ الفاظ تھے "دیکھیے کیا ہوتا ہے خدا خیر کرے!" پمفلٹ کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا،

"میں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں حد سے زیادہ کوشش کی کہ فلاں فلاں امور میں اصلاحات بروئے کار لاؤں، مگر ہر موقع پر پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد میری راہ میں روڑے اٹکاتے رہے۔ اپنے انتخاب کے دوسرے روز ہی علی الصبح میں یونیورسٹی کی مسجد میں گیا اور مؤذن کی عدم موجودگی میں خود ہی اذان دی۔ امام صاحب بھی غیر حاضر تھے۔ آخر بمشکل چار پانچ طالب علم جو آ گئے تھے ان کے ساتھ فریضۂ فجر ادا کیا۔
جب ناظم دینیات سے اس عام بے توجہی کی وجہ پوچھی اور دینیات سے متعلق

بعض مسائل پر گفتگو کی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ حد یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہ بتا سکے کہ ایک ناظم کے ذمے کیا فرائض ہوتے ہیں! ان وجوہ سے مجبور ہو کر میں یہ پمفلٹ شائع کرتا ہوں تاکہ اربابِ اقتدار جلد اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال ایک دردمند اور بیدار مغز رئیسہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کی چانسلر تھیں اور ممدوحہ کے فرزند نواب حمید اللہ خاں جو اعیانِ ملک میں ملی حمیت اور گہری بصیرت کا بے مثال نمونہ اور یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے، ان کے مشیر کار تھے۔ جب ان کی نظر سے یہ تحریر گزری تو ان کے حکم سے ان شکایات کی تحقیق کے لئے رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ اور ارکان دو مشاہیر ماہرِ تعلیم انگریز تھے، کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن کے مصارف اٹھارہ ہزار ہوئے جو اس زمانے میں بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ یہ رقم بیگم صاحبہ نے اپنی جیبِ خاص سے عطا فرمائی۔

ڈیڑھ دو سال کی مسلسل تگ و دو اور بند کمرے میں ذمہ دار اصحاب کی شہادتوں کے بعد خدا خدا کر کے کمیشن کی رپورٹ منظرِ عام پر آئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کی خدمات سے سبکدوش کیا جائے اور ادارے کا چارج بانی کالج کے نامور پوتے سید راس مسعود کو سونپا جائے جو اس زمانے میں مملکتِ دکن کی تعلیمات کے اعلیٰ افسر تھے۔ من جملہ دوسری اصلاحات کے اساتذہ کا رد و بدل اور انٹرمیڈیٹ کالج کی موقوفی بھی عمل میں آئی۔ اس موقع پر صرف دو استاد کالج سے یونیورسٹی میں ترقی پر لئے گئے، ایک شیخ عبدالرشید اور راقم سطور۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی تعطیل گرما کا واقعہ ہے۔

سید راس مسعود کے نام نے درحقیقت جادو کا کام کیا۔ دیکھتے دیکھتے علی گڑھ کی فضا یکسر علمی و تعلیمی ہو گئی۔ اساتذہ میں ذمہ داری کا احساس اور طلباء میں اپنے فرائض کا پاس پہلے سے دوچند ہو گیا، جدھر دیکھو علمی چرچے، جہاں جاؤ تحقیق کے جلوے۔ نئے وائس چانسلر اپنی اصلاحی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لئے ایک مشہور ماہرِ تعلیم مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر کی حیثیت

سے ساتھ لائے تھے جنھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ حالات کو سدھارا، مگر افسوس کہ
ایک سال کے اندر ہی علی گڑھ کی لُو کا شکار ہو گئے۔ ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

علی گڑھ آکر راس مسعود نے اپنی پالیسی کے بارے میں جو پہلی زلزلہ فگن تقریر کی وہ
عمر بھر بھولنے والی نہیں۔ وہ جس طرح ایک طلیق اللسان تھے اسی طرح ایک جادو بیان مقرر
بھی تھے جب بولتے تھے ایسا لگتا کہ ایک لشکرِ جرار دھاوا مارتا چلا آرہا ہے۔ اُن کو اُردو
اور انگریزی پر بے نظیر قدرت حاصل تھی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اپنے مرحوم دادا کی امانت کی
نگہداشت کرتے ہوئے ممکن ہے کہیں مجھ سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جائے مگر میری نیت
ہمیشہ نیک ہوگی۔ یہ جو کہا گیا محض قول نہ تھا بلکہ اپنے عمل سے ہم دوش۔ میں سمجھتا
ہوں کہ مرحوم کی لُغت میں قول بلا عمل کے الفاظ ہی نہ تھے۔ میں نے سر سید اور جسٹس محمود
کو نہیں دیکھا، البتہ سید راس مسعود کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ عالی دماغ اور عالی ظرف
ایسے ہوتے ہیں۔ اُن سے پہلے نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب جو ایک نرم مزاج،
علم دوست اور فیاض رئیس تھے منصب وائس چانسلری پر فائز تھے اور تمام سیاہ و سفید
کا اختیار ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے ہاتھ میں تھا۔ یونیورسٹی کے معاملات پرانے ڈھرے پر
چل رہے تھے۔ سید راس مسعود اور مسٹر ہارلن کا آنا تھا کہ بالکل کایا ہی پلٹ گئی اور تمام
امور میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی کمیشن کی سفارشات پر عمل ہونے لگا۔

حکومت میں ان کا یہ وقار تھا کہ بڑے بڑے یوروپین افسروں کو آدھا نام لے کر
پکارتے تھے، والیانِ ملک میں یہ اعزاز کہ اعلیٰ حضرت نظام دکن سے یونیورسٹی کے لئے
لاکھوں لاتے تھے۔ پبلک لیڈروں میں یہ وقعت کہ اُن کی دعوت پر کبھی گاندھی جی اور
پنڈت جواہر لعل نہرو اور کبھی علی برادران اور علامہ اقبال علی گڑھ آتے اور کئی کئی دن اُن کے
مہمان رہتے۔

یہ بھی سُنا دوں کہ سید صاحب کی خدمت میں میری باریابی کی تقریب کیونکر ہوئی،
بات یہ تھی کہ سید صاحب لمبی تعطیل گزار کر یورپ سے تشریف لا رہے تھے اور اُن کے
اعزاز میں ارکانِ کالج نے ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ میرے خاص کرم فرماؤں میں مرحوم عبد العزیز
پوری صاحب نے اصرار کیا کہ اس تقریب میں مسعود پر نظم ضرور ہونی چاہیئے! محبی حافظ صاحب
نے فرمایا کہ میں خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز سے پڑھ دوں گا۔ میں کہ مجمع سے لوگوں کے
یہاں حاضر باشی اور معزز مہمانوں کی آمد پر قصیدہ نگاری کو خلاف وضع سمجھتا تھا اور اب
بھی سمجھتا ہوں، عذر کرنے لگا لیکن بالآخر ان کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا اور میں نے
ارتجالاً قاآنی کی زمین میں فارسی کے چند اشعار بطور تہنیت و تبریک لکھ دیئے جب شب
کو محفلِ حضار میں پڑھے گئے تو سب نے بے حد پسند کیے اور سید راس مسعود کمال درجہ
متاثر ہوئے، چنانچہ نظم کے اختتام پر مجھے طلب کیا اور نہایت اخلاق سے پرسش حال
کر کے فرمایا کہ "مجھ سے ملتے رہنا!"

مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی نئے شخص سے ملتے، تو اس کا امتحان ضرور لیتے
اور اس خوبی کے ساتھ کہ پتہ نہ چلتا کہ امتحان ہو رہا ہے۔ میں جب پہلی بار کوٹھی پر حاضر ہوا
تو یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے غالب کے حسب ذیل شعر کا مطلب دریافت فرمایا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

جب میں نے مطلب بتایا، تو بہت محظوظ ہوئے۔ اُن کے ذہن میں اُردو کلاسیکل لٹریچر
کو مغربی GET UP کے ساتھ ارزاں قیمت پر گھر گھر پھیلانے کی اور ملک کے گوشے
گوشے سے نادر کُتب لا کر علی گڑھ میں جمع کرنے کی ایک بڑی اسکیم تھی جس کو ظاہر کر کے
فرمایا کہ "آیا تم اس میں مجھے مدد دے سکتے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ "جہاں تک میرے
امکان میں ہے میں حاضر ہوں"۔ افسوس کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اسکیم قول سے

فعل میں نہ آسکی۔ وہ علی گڑھ سے بد دل ہو کر بھوپال تشریف لے گئے اور وہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

سید راس مسعود کے علی گڑھ چھوڑنے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جو پہلے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے، وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ اگرچہ راس مسعود صاحب اور ڈاکٹر صاحب میں نظریاتی اختلاف تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کے دماغ کی رسائی، معاملہ فہمی اور کارگزاری میں کوئی شبہ نہ تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور غریب طلبار کی مشکلات خوب سمجھتے تھے۔ وہ علی گڑھ کی ہر رگ سے واقف تھے اور آپ اُسے اچھا کہیں یا بُرا، معمولی ملازم سے لے کر اعلیٰ پروفیسر تک کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

علی گڑھ والوں کا TACT (مردم شناسی) مسلّم ہے اور ڈاکٹر صاحب TACT کا کامل نمونہ تھے۔ TACT پر ایک قصہ یاد آیا جو ایک دفعہ موصوف ہی نے بیان فرمایا تھا۔ کہتے تھے کہ ایک دفعہ میرا ایک کمیشن پر جانا ہوا جس کے ممبر میرے علاوہ دو اعلیٰ انگریز عہدیدار بھی تھے۔ قیام کسی پہاڑی تھا جہاں ایک اجڑے ہوئے ڈاک بنگلے اور ایک بوڑھے چوکیدار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک ساتھی نے کہا ڈاکٹر! اس وقت چائے کی سخت خواہش ہے، تم کہا کرتے ہو کہ علیگیرین بڑے TACTFUL ہوتے ہیں، اگر چائے پلواؤ تو جانیں! میں نے جواب دیا ٹھہریے سب انتظام ہوا جاتا ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چوکیدار نے خبر دی کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بلایا تو معلوم ہوا کہ علاقے کے تحصیلدار ہیں اور ہم لوگوں کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھ کر کئی میل سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہاں چائے کا بندوبست ممکن ہے؟ بولے جی میں لیتا آیا ہوں۔ ذرا دیر میں میز چائے کے سامان، مکھن، توسٹ، کیک اور پھلوں سے بھر گئی۔ میں نے دونوں ساتھیوں کو آواز دی اور وہ یہ لوازم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

ڈاکٹر صاحب پر اکثر اصحاب نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اعتراض کے ساتھ ہی اُن کے دو وصفوں کا اعتراف بھی کرتے تھے یعنی اپنے مخالفوں کو بھی نقصان نہ پہنچانا اور علی گڑھ چھوڑنے پر بھی دلی کے زمانۂ قیام میں فرزندانِ درس گاہ کے کام آنا۔ اکثر دیکھا گیا کہ ریل سے اُتر کر گھر آئے اور فوراً بغیر لباس تبدیل کئے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کاغذات دیکھنے لگے۔ حد یہ ہے کہ گھر کے اندر بیوی پر سکرات کا عالم طاری ہے اور وہ باہر دفتر میں بیٹھے یونیورسٹی میں کسی آنے والے معزز مہمان کی پذیرائی کے لئے ہدایات دے رہے ہیں۔

سر شاہ سلیمان کی وائس چانسلری کا دور بھی بڑا شاندار تھا۔ موصوف اُن اعلیٰ اوصاف کے حامل تھے جو کسی قوم کے لئے بھی باعثِ نازش ہو سکتے ہیں۔ قانون، ریاضی، سائنس عربی اور اردو میں اُن کی ہستی نادرِ عصر میں شمار ہونے کے قابل تھی۔ دماغ اور زبان اس قدر عجلت کے ساتھ کام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ادھر آپ نے اپنی بات تمام نہیں کی ادھر انہوں نے آپ کا مافی الضمیر سمجھ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ بے مثال قابلیت اور اعلیٰ دنیوی اعزاز کے باوجود اسلامیت، مشرقیت اور کسرِ نفسی کا مکمل نمونہ تھے۔

شروع شروع میں جب وہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے اور اپنے والد ماجد کی خدمت میں الٰہ آباد حاضر ہوئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ جب والد صاحب جانے کے لئے اٹھنے لگے، تو انہوں نے کمال ادب سے اُن کے جوتے اٹھا کر سامنے رکھ دیئے۔ دیکھنے والوں نے اسی وقت ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی؛ چنانچہ وہ جوڈیشل سروس کے اونچے سے اونچے مناصب پر سرفراز ہوئے۔

علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں وہ دلی سے ہر ہفتے میں دو دن علی گڑھ تشریف لاتے اور اپنے سفر اور قیام کے مصارف کا بار خود اٹھاتے حتیٰ کہ ڈائننگ ہال کے کھانے کے دام تک اپنی جیب سے دیتے اور رات کو ہوسٹل کے کسی کمرے میں آرام

کر لیتے تھے۔

نواب اسماعیل خاں ایک بھاری بھرکم، پُر وقار شخصیت والے وائس چانسلر تھے مگر وہ زیادہ دنوں تک وائس چانسلر نہ رہ سکے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین آئے۔ ذاکر صاحب جس بلند و بالا شخصیت کے مالک اور دل و دماغ کی جن عظیم صلاحیتوں کے جامع تھے ان سے ایک دنیا واقف ہے، لیکن صحت کے روز افزوں انحطاط نے موصوف کو علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا اور بعد کو حکومت ہند کے اصرار نے ان کو اپنی جانب کھینچ لیا، جہاں گورنری، نیابت اور صدارت ان کی پذیرائی کی منتظر تھیں۔

زیدی صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین کے نقشِ قدم پر چلے اور خاصے کامیاب رہے۔ اُن کے بعد بدرالدین طیب جی کا زمانہ آیا اور علی گڑھ کے لئے نئی بشارت لایا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک آئی سی ایس یہاں کیا کامیاب ہوگا۔ مگر طیب جی نے اپنی بے لاگ، کھری، مدبرانہ اور ہمدردانہ روش سے اس طرح کام کیا کہ علی گڑھ والے ان کو آج تک محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔

لیجئے ذکر سر سید راس مسعود صاحب کا ہو رہا تھا لیکن ضمناً میرے دور کے دوسرے وائس چانسلر حضرات بھی آگئے۔ بہر حال اب میں یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں منتقل ہو گیا جہاں مدت تک لیکچرر اور ریڈر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یونیورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے ملتی جلتی تھی، مگر زندگی یہاں زیادہ بھرپور، مکمل اور ہمہ جہتی نظر آتی تھی گویا کالج دریا تھا اور یونیورسٹی سمندر، حکام یونیورسٹی ہمدرد تھے، رفقائے کار قدر دان، اور طلبا ادب شناس، پھر اور کیا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی کبھی ہوس ہی نہ کی۔ یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک عام درس گاہ نہیں ہے جس میں چھوٹے بڑے افسر اور ماتحت کا سوال ہو، بلکہ ایک کنبہ ہے جس کے اندر استاد بزرگ خاندان یا باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور شاگرد اولاد کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام طلبا جن میں نواب زادے، امیر زادے، متوسط حال اور غریب ہر درجے کے شامل

تھے۔ پھر سب کی فطرت جدا، خصلت جدا، میرے خلوص کا جواب احترام سے دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ لوگ اپنی درسیات میں مدد لینے یا اپنی ذاتی مشکلات میں مشورہ چاہنے کے لئے میرے مکان پر آئے ہیں اور میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھوڑ، سات سات گھنٹے اُن کے کام میں منہمک رہا ہوں۔ انہی مخلصانہ تعلقات کا اثر ہے کہ اب بھی اُس زمانے کے طلبا جو اکثر اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں، جب مل جاتے ہیں، تو انتہائی ارادت سے پیش آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم قومی درس گاہ کو محض اینٹ اور چونے کی عمارت تصور کرنا بڑی غلطی ہوگی، یہ سر سید اور اُن کے لائق رفقائے کار، نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، زین العابدین اور مولوی سمیع اللہ کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس نے ہر زمانے میں بڑے بڑے مردانِ کار پیدا کئے۔ میر ولایت حسین، ڈپٹی حبیب اللہ خاں، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں اور سید طفیل احمد منگلوری جیسے فدایانِ ملت، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر مولوی عبد الحق اور مولوی عزیز مرزا جیسے فاضلانِ عصر، علی برادران، رفیع احمد قدوائی، راجہ مہندر پرتاپ، خواجہ غلام الثقلین، سر سید راس مسعود، ڈاکٹر سید محمود، خواجہ عبد المجید، صدر پاکستان محمد ایوب خاں، خان بہادر شیخ عبد اللہ، سردار عبد الرب نشتر، اور نواب حمید اللہ خاں والئی بھوپال جیسے ممتاز رہنما، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین اور پروفیسر عبد المجید قریشی جیسے ماہرینِ تعلیم، مولانا ظفر علی خاں، میر محفوظ علی بدایونی، قاضی عبد الغفار، مولوی عنایت اللہ دہلوی، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، سید سجاد حیدر یلدرم، چودھری خوشی محمد ناظر، مولانا حسرت موہانی اور حضرت فانی بدایونی جیسے کاملانِ ادب و شعر اسی درس گاہ کی آغوش کے تربیت یافتہ ہیں۔

میرے زمانے میں جو اساتذہ یہاں برسرِ کار تھے اُن میں اکثر کی ہستی کسی یونیورسٹی

کے لئے بھی سرمایۂ مباہات ہو سکتی تھی۔ تاریخ میں پروفیسر محمد حبیب۔ تعلیمات میں پروفیسر حبیب الرحمن، فلسفے میں ڈاکٹر ظفر الحسن، معاشیات میں ڈاکٹر ایل کے حیدر، سائنس میں پروفیسر بابر مرزا اور کرنل حیدر خاں، شعبۂ دینیات میں مولانا سلیمان اشرف اور مولانا راغب بدیوانی، عربی میں مولانا عبدالعزیز میمن، اُردو میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی واشباہم کے علمی و عملی اکتسابات کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے، مگر بخوف طوالت چھوڑتا ہوں، البتہ جی نہیں مانتا کہ اپنے شعبے کے رفقاء کے بارے میں چند جملے کہے بغیر گزر جاؤں۔

شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر ہادی حسن تھے جن کو قدرت نے غیر معمولی ذہن اور حافظہ دیا تھا، سرو قد، خوبرو، خندہ پیشانی کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں، نقل کرنے پر آئیں تو روتوں کو ہنسائیں، جب وہ اسپیچ دیتے تھے تو ہزاروں کے مجمعے پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ع کسی کی آنکھ میں جادو تیری زبان میں ہے۔ ان میں دونوں باتیں تھیں۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک بار جب وہ انگریزی میں تقریر ختم کر چکے تو فاضل صدر جلسہ ریفر باتھم پرو وائس چانسلر نے اعتراف کیا: I CANNOT EXPRESS MYSELF SO BEAUTIFULLY AS DR. HADI HASAN HAS DONE

اسی طرح جب وہ گل افشانیٔ گفتار پر آتے تو اچھے اچھے ایرانی فضلا تصویر حیرت بن جاتے۔ یونیورسٹی میڈیکل کالج کے لئے قوم سے پچاس لاکھ روپے کی رقم وصول کر لینا ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی کوشش اور ڈاکٹر ہادی حسن کی کاوش ہی کا ثمرہ تھا۔ شعبے کے دوسرے استاد الحاج حمید الدین خاں تھے جو علی گڑھ کے عاشق بھی تھے اور ناقد بھی۔ وقت کے اتنے پابند اور اصول کے اتنے سخت کہ خواہ وائس چانسلر کے ہاں میٹنگ ہو یا ایم اے کی کلاس ہو، اگر اول الذکر کو کوئی کام ہو گیا یا آخر الذکر پانچ منٹ دیر سے آئے تو آپ قطعاً نہیں ٹھہرتے تھے، پورٹ فولیو اٹھایا اور یہ جا وہ جا۔ نہایت بے لوث اور بے حد بے باک۔ لوگ اس کو ان کی درشت مزاجی پر محمول کرتے تھے لیکن میں تو اصول پرستی کہتا ہوں۔

یادش بخیر محمد حاذق انتہا کے باغ و بہار اور بلا کے بذلہ سنج دوستوں کے دوست، ساتھیوں پر شفیق۔

قارئین شاید ناخوش ہوں کہ میں نے اب تک علی گڑھ کے عام ماحول اور وہاں کے طلبا کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مجھے خود اس بات کا خیال ہے، مگر کیا کیا جائے بات سے بات نکلتی چلی گئی ورنہ در اصل ٹیپ کا بند تو یہی تھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ علی گڑھ کی فضا بے تعصبی میں اور اس کے طلبا امن پسندی میں مثالی حیثیت کے مالک تھے۔

شروع سے علی گڑھ کے دروازے بغیر امتیاز مذہب و قوم ہر ایک کے لئے کھلے رہے ہیں، شاید لوگوں کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ ایم اے او کالج کے سب سے پہلے گریجوایٹ بابو ایشری پرشاد ساکن ضلع علی گڑھ تھے۔ وہاں کے طویل زمانۂ قیام میں، میں نے اساتذہ کو بھی برتا اور طلبا کو بھی پرکھا لیکن بات چیت میں، برتاؤ میں، رکھ رکھاؤ میں کبھی یہ سوال نہ اٹھا کہ فلاں مسلمان ہے اور فلاں ہندو یا عمر سُنّی ہے اور زید شیعہ۔ غور کیجئے تو یہ بڑی بات ہے۔ جمعہ یا عیدین میں جب اہل سنت کا جم غفیر دوگانہ پڑھ کر مسجد سے باہر آتا اور شیعہ حضرات نماز کے لئے داخل ہوتے، تو وہ دلکش منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا۔

آج ہر جگہ نوجوانوں کی قانون شکنی حد سے تجاوز کر گئی ہے، علی گڑھ والوں کا ڈسپلن ضرب المثل ہو گیا تھا۔ استثنائی صورتیں کہاں نہیں ہوتیں، مگر فیصلہ سوادِ اعظم کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب گاندھی جی اور علی برادران نے ترک موالات کا فیصلہ کیا اور جب یورپ نے ترکی کے مرد بیمار کا خاتمہ کرنا چاہا، جب بہار اور کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا، جب علی گڑھ میں سیلاب نے ستم ڈھایا، تو یہی علی گڑھ کے فرزند تھے جو خدمت خلق کے جذبے سے سرشار، سرفروشی کو تیار ہو گئے۔

آخر میں شاعر کا ہم نوا ہو کر مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

دارم دلے ز آبلہ نازک نہادتر   آہستہ پا نہیم کہ سرِ خار نازک است

پروفیسر آل احمد سرور

میں ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آیا۔ سر راس مسعود کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ چونکہ میرے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تھا اس لئے انہی کے پاس رہنے لگا۔ دوسرے سال جب یونین کا نائب صدر ہوا، تو ایس ایس ایسٹ ہوسٹل میں چلا آیا۔

علی گڑھ میں میں سب سے پہلے خواجہ منظور حسین صاحب سے متاثر ہوا۔ یہ میرے انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی ادب پر گہری نظر کے علاوہ اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ کلاس میں لیکچر دینے کے بجائے اپنے لیکچر پڑھا کرتے تھے۔ ان لیکچروں سے فائدہ اس وقت ممکن تھا جب خود بھی مطالعہ اچھا ہو۔ انگریزی میں تخلیقی ادب کا مطالعہ میرا اچھا خاصا تھا، مگر باقاعدہ نہ تھا۔ شروع شروع میں اُن کے لیکچر بے کیف معلوم ہوئے مگر جب خود پڑھنا شروع کیا، تو اُن کی خوبیاں آشکار ہوئیں۔ منظور صاحب اچھے طلبا کی بڑی مدد کرتے تھے۔ اُن کو مناسب ہدایت کرتے خود اپنے پاس سے کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے اور موقع موقع سے اُردو ادب کے حوالے دیتے۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں علی گڑھ میگزین کے نگران تھے۔ انہوں نے مجھے میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس سلسلے میں رشید صاحب، سید ین صاحب اور علی گڑھ کے دوسرے اہل نظر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

خواجہ منظور حسین صاحب ادب کے رسیا، کتابوں کے عاشق اور نہایت باذوق آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر جانسن اس طرح پڑھایا کہ مجھے جانسن کی شخصیت سے بھی ایک لگاؤ پیدا ہوگیا اور اس زمانے میں میں نے جانسن کی اہمیت پر رائے لٹریری سوسائٹی میں ایک مقالہ پڑھا۔ انہی کے ذریعے سے میں ادب میں ترقی پسند تحریک سے روشناس

" ایم اے کرنے کے بعد والدین کی خواہش تھی کہ میں آئی سی ایس کروں۔ مگر میرا دل معلمی کو پسند کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ روا روی میں کہا تھا کہ آئی سی ایس کر کے کیا کیجیے گا۔ کچھ علی گڑھ اور اُردو کی خدمت کیجیے۔ یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ پھر نہ نکل سکی "

ہوا۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف سے ملاقات انہی کے توسط سے ہوئی۔ منظور صاحب آزادیٔ ہند کے بعد لاہور چلے گئے۔ جاتے وقت مجھے لکھنؤ خط لکھا تھا، تو غالب کا یہ شعر بھی اس میں درج تھا:

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

رشید صاحب سے پہلی دفعہ میگزین کے لئے مضمون مانگنے کے لئے ملا، تو رسمی ملاقات ہوئی۔ علی گڑھ والوں کی اصطلاح میں انہوں نے کچھ زیادہ لفٹ نہ دیا۔ دوبارہ ملا تو یونین کے ایک آل انڈیا مباحثے میں تقریر کر چکا تھا جس میں وہ بھی جج تھے۔ اب کے وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور مجھ پر لطف و کرم کی بارش کر دی۔ میں ان کے یہاں اکثر جانے لگا، ہر مسئلے پر گھنٹوں گفتگو ہونے لگی۔ ان کا گھر اچھا خاصا مہمان خانہ تھا۔ ہر قسم کے لوگ آتے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، اصغر گونڈوی، سید سلیمان ندوی، حفیظ جالندھری ان سب سے ملاقات رشید صاحب ہی کے یہاں ہوئی۔

رشید صاحب نے میرے اصرار پر میگزین کے لئے کئی مضمون لکھے۔ مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ شروع شروع میں شعر و ادب کے عشق نے مجھے اصغر صاحب کا زیادہ ہی گرویدہ رکھا۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ ذاکر صاحب سے کئی دفعہ یونہی ملاقات ہوئی مگر سال ڈیڑھ سال کے بعد دیکھتا ہوں تو بہت سے ساحری فن پیچھے رہ گئے اور میں ذاکر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا۔

منظور صاحب نے مجھے عالی معیاروں سے آشنا کیا اور انگریزی ادب سے عشق سکھایا۔ رشید صاحب نے اُردو ادب کی خدمت کی طرف مائل کیا۔ ذاکر صاحب نے ادب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کرنا سکھایا۔ ایم اے کے دوران میں یہ

یونین کا نائب صدر تھا۔ اس سلسلے میں راس مسعود صاحب سے ربط ضبط بڑھا۔ وہ وائس چانسلر تھے۔ اُن کا حافظہ غضب کا تھا۔ فارسی اور اُردو کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ گفتگو میں اُن کی جادوگری مشہور تھی۔ بڑے حوصلے اور عزم کے آدمی تھے، مگر عملی قوت کم تھی۔ بہت سے ذہین آدمیوں کی طرح وہ خاصے آرام طلب تھے۔ علی گڑھ میں اُنھوں نے اچھے اچھے آدمی بلائے اور کئی مفید کام شروع کئے، مگر اُن میں اتنا استقلال نہ تھا کہ وہ ان کاموں کی خاطر قدم جما کر بیٹھتے۔ اس لئے میں اُن کا قائل رہا، مگر اُن سے زیادہ متاثر نہ ہو سکا۔

ایم اے کرنے کے بعد والدین کی خواہش تھی کہ میں آئی سی ایس کروں، مگر میرا دل معلمی کو پسند کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ روا روی میں کہا تھا کہ آئی سی ایس کرکے کیا کیجئے گا، بچے علی گڑھ اور اُردو کی خدمت کیجئے۔" یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ پھر نکل نہ سکی۔ معلمی کے پیشے اور اُردو ادب کی خدمت میں مجھے اب وہ اعزاز و افتخار محسوس ہوتا ہے جو دولت و سیاست کی اونچی مسند کو بھی نصیب نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں یہ فیصلہ کیا تھا، اُس وقت سے اب تک میری اور ملک کی زندگی میں کتنے نشیب و فراز آچکے ہیں، مگر وہ روحانی طمانیت اور ذہنی سکون جو اس لگاؤ سے حاصل ہوا تھا اب بھی میرا رفیقِ سفر ہے۔

منظور صاحب کا اثر مجھ پر طالب علمی کے زمانے تک بہت گہرا رہا۔ ۱۹۳۴ء کے اکتوبر میں شعبۂ انگریزی میں لیکچرر ہو گیا، مگر رشید صاحب اور ذاکر صاحب سے میرے مراسم بڑھتے گئے۔ رشید صاحب کی شرافت، خدمتِ خلق کا جذبہ، علی گڑھ سے عشق، نوجوانوں کی ہمت افزائی اور دوستوں کی پاسداری یہ چیزیں اس زمانے میں بڑی کشش کا باعث تھیں۔ اُن کی خیال انگیز ظرافت اور ان کے جاندار اسلوب سے بھی خاصا متاثر تھا، مگر علی گڑھ سے اُن کا اس درجہ رومانوی عشق میری سمجھ میں نہیں آیا۔

سرسید کی تحریک کا میرے دل میں بڑا احترام ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ دورِ جدید کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں، مگر ایم اے او کالج سرسید کی فکرِ روشن کا ایک گوشہ، وہ ان کے سنہرے خوابوں کی ایک ادھوری تعبیر اور ہماری تعلیمی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی بساط پر صرف ایک تختۂ رنگین ہے، سارا چمن نہیں۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر صاحب علی گڑھ کو عزیز رکھتے ہوئے بھی اور اپنی چیز کسے عزیز نہیں ہوتی! اس کی خامیوں سے واقف تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان دیدہ وروں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ کی بستی چھوڑ کر جامعہ کے ویرانے میں پھول کھلائے تاکہ ملک کو قومی تعلیم کے تجربے سے آشنا کرائیں۔ انہوں نے مغرب کی حکمت اور مشرق کے سوز دروں کو اپنی شخصیت میں اس طرح سمو لیا کہ ہر سیاسی دور کے لئے آبِ حیات بن گئے۔ وہ فکر کی بلندی اور علم کی رفعت کے باوجود عمل کی راہ کو ہموار کرنے اور جامعہ کو قبولِ عام عطا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ میں جامعہ میں آجاؤں، انہوں نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا، اگر کرتے تو شاید میں چلا ہی جاتا، مگر علی گڑھ میں مجھے درس و تدریس کے علاوہ شعر و ادب سے ایک گہرے لگاؤ اور اپنے مطالعے کو وسیع کرنے کی دھن نے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب سے جو قرب اس وقت ہوگیا تھا وقت کے ساتھ وہ گہرا ہی ہوتا رہا۔ میں نے جامعہ کی جوبلی بھی دیکھی اور ڈاکٹر صاحب کی علی گڑھ کی وائس چانسلری کا دور بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جوبلی میں ڈاکٹر صاحب پر ایک عجیب جذب کا عالم طاری تھا۔ ان کی وہ تقریر جو انہوں نے کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے سامنے کی تھی، آج بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔ انہوں نے جس طرح علی گڑھ کی اس وقت (۱۹۴۷ء میں) مدد کی، جب اس کا وجود خطرے میں تھا، اُسے قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب مفکر ہیں، مدبر نہیں، وہ فرشتہ صفت آدمی ہیں، داؤ پیچ سے واقف نہیں، لوگوں نے اُن کی سادگی سے فائدہ اٹھایا ہے، اس سے ڈاکٹر صاحب کا کچھ نہیں بگڑا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے راستے پر گامزن ہیں وہ لوگ جہاں تھے وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد علی گڑھ کی سب سے اہم شخصیت تھے اور اپنے داؤ پیچ کی وجہ سے علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوگئے تھے۔ مجھے انہیں خاصے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اسی مطالعے نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کی کہ اگر ہماری تعلیم کا مقصد ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ پیدا کرنا ہے، تو اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ تاثر کا صرف مثبت پہلو عام طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی پوری زندگی اُن کے معیار اور طریقے میرے سامنے تھے۔ میں نے اُن سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر تعلیم گاہوں کی قیادت ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رہی، تو علم جنتر منتر اور عمل ترکیب کے مترادف ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہر چیز اپنے اقتدار کے استحکام کی رو سے پرکھی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک انگریزی کے استادوں کا مقصد یونیورسٹی کے مہمانوں کے لئے سپاسنامے لکھنا اور اردو کے استادوں کا کام اُن کی شان میں قصیدے پڑھنا تھا۔ وہ اُبھرتے سورج، چلتی گاڑی کے ماننے والے تھے، وہ اپنی دانست میں علی گڑھ اور قوم کی بڑی خدمت کر رہے تھے۔ ان میں بلا کی عملی قوت تھی، وہ تھکنا اور مایوس ہو جانا ہی نہیں جانتے تھے، مگر ان کے اثر سے استادوں میں علم کی لگن اور طلبا میں علم کا جذبہ کم ہوگیا تھا اور وہ سب سستی اور سطحی سیاست کے شکار ہوگئے۔

●● علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لیے عزیز تھا کہ اُس میں ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان فراہم تھا۔ ہر شخص اپنے رنگ میں مست رہتا تھا۔ میں احمر نفیس کے پاس جاتا کر چلو بھئی ذرا باہر ہو آئیں۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے :

"بیٹھو تو سہی" پھر کہتے، "شنو یار! ظالم نے کس غضب کا شعر کہا ہے ؎

کیا حُسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

جب میں پوچھتا کہ یہ شعر کس کا ہے، تو اپنے خاص انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگاتے اور کہتے ہیں :

"قسم خدا کی محفوظ تمہارا بھی جواب نہیں ہاہا"

جناب محفوظ الحق حقّی

میٹرک پاس کرنے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنی خوشی اس بات کی تھی کہ اب مسلم یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤں گا۔ ہوش سنبھالتے ہی سر سید احمد خاں اور مسلم یونیورسٹی کا تذکرہ اور حالات سنتا چلا آ رہا تھا۔ طلبہ کے اتحاد کے چرچے بھی سن رکھے تھے اور یہ بھی مجھے معلوم تھا کہ نئے طلبا کا طرح طرح سے مذاق اڑایا جاتا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ایک ایک دن گن کر کاٹیں، خدا خدا کر کے سات جولائی آئی جس دن یونیورسٹی کھلی۔ دل کی عجیب کیفیت تھی اور طبیعت میں غیر معمولی سنجیدہ پن اور خود اعتمادی کا جذبہ تھا۔

لقوی پارک سے ہوتا ہوا میں جب یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوا تو سامنے عظیم وکٹوریہ گیٹ دکھائی دیا۔ اس کے اوپر کا گھنٹہ گھر اسی شان و شوکت کے ساتھ وقت بتا رہا تھا جس شان و شوکت کے ساتھ انگلستان کی پارلیمنٹ کا بگ بین۔ وکٹوریہ گیٹ میں سے گزر کر سر سید کورٹ میں پہنچے، تو سامنے یونیورسٹی کا شہرۂ آفاق اسٹریچی ہال نظر آیا۔ یہ وہی ہال ہے کہ جس کے جلسوں میں مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر محمد اشرف طالب علمی ہی کے زمانے میں اپنی شعلہ بیانی کا لوہا منوا چکے تھے۔

قرأت کی کلاس یونیورسٹی کی جامع مسجد کے جانبِ مشرق ایک کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ اُس زمانے کے سُنّی دینیات کے ڈین مولانا وصی علی قرأت کی کلاس لیا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے شمالی حصے میں سر سید احمد خاں اور دوسرے اکابرین کی ابدی آرام گاہیں

ہیں۔ وہاں جاکر فاتحہ پڑھی۔ اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل پر بھی اُس سے کچھ کم اثر نہیں ہوا
جو علامہ اقبالؒ کے دل پر مسجدِ قرطبہ دیکھ کر ہوا تھا۔

کاش! مولانا الطاف حسینؒ حالی اس وقت زندہ ہوتے اور یونیورسٹی کو اور اس جامع مسجد کو دیکھتے تو کس قدر خوش ہوتے! ۱۸۷۹ء میں جب مولانا حالی علی گڑھ تشریف لائے، تو اس وقت یہاں دو بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کچی اور دوسری پکی۔ آج کل یہاں سرسید کورٹ کی شاندار عمارت بن جانے کے باوجود بہت سے لوگ اب بھی ان جگہوں کو کچی بارک اور پکی بارک ہی کہتے ہیں۔ اس شاندار جامع مسجد کی جگہ صرف ایک چبوترہ تھا جس پر نماز ہوا کرتی تھی۔ مولانا حالی نے بھی یہاں نماز ادا کی، اور اس کی کیفیت انہوں نے ان الفاظ میں بیان فرمائی:

"اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا، مگر اسے دیکھ کر ہمارے دل پر جو اثر ہوا اس کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس میں حاضر ہوئے ہیں، ہم نے اونچے اونچے منبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سُنے ہیں، ہم حال و قال کی محفلوں میں بھی شریک ہوئے ہیں ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سُنے ہیں، مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسے کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے، وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔"

مجھے میرے دوست قمر نے بتایا کہ مولانا شوکت علیؒ جب علی گڑھ میں کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے، ولنگڈن پویلین پر انگلستان اور علی گڑھ کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ مولانا شوکت علی بیٹنگ کر رہے تھے۔ ایک گیند پر اس زور سے ہٹ لگائی کہ گیند پورے پویلین کو کراس کرتی ہوئی جامع مسجد کی بلندی کو پار کر کے صحنِ مسجد میں آ گری

اس ریکارڈ کو آج تک کوئی کھلاڑی توڑنے کا اعزاز حاصل نہ کر سکا۔

جامع مسجد دیکھنے کے بعد ہم دونوں 'باب العلم' میں سے گزر کر ولنگڈن پویلین دیکھتے ہوئے ایک عمارت میں جا پہنچے، جو علی گڑھ اولڈ بوائز لاج کے نام سے موسوم ہے۔ اس عمارت کی بنیاد علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے مولانا محمد علیؒ نے اُس وقت رکھی۔ جب مولانا تحریکِ عدمِ تعاون کے سلسلے میں یونیورسٹی کو بند کرانے کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ یہ عمارت ایک قسم کا اولڈ بوائز کے واسطے ریسٹ ہاؤس ہے۔

علی گڑھ میں داخلے کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے میں آسانی سے گزر گیا، کیونکہ میں نے میٹرک علی گڑھ ہی سے کیا تھا اور بہت سے طلبا پہلے ہی سے واقف تھے۔ سالِ دوم کے طلبا نئے طلبا کی تلاش میں گِدھوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں اور نئے طلبا کو پہچانتے ہیں۔ یہ طلبا غضب کی مہارت رکھتے ہیں۔ چال ڈھال ہی سے تاڑ جاتے ہیں کہ کوئی نیا پھنسا ہے اور اسے فوراً جا لیتے ہیں۔ جیسے پیار سے اُس سے مخاطب ہوتے اور پھر علی گڑھ ہی کی اصطلاح میں اس کی وہ کھنچائی کرتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی!

جس زمانے میں میں نے داخلہ لیا اُس وقت نئے طلبا کا مذاق بنانے میں وارثِ پراس Top پر تھے، بلکہ یہ اس پارٹی کے سرخیل تھے۔ میری جان بخشی کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے اور سر راس کے خاندانی تعلقات تھے، البتہ فاروق کی بُری طرح خبر لے ڈالی ہوا یہ کہ فاروق داخلے کا فارم بھر ہی رہے تھے کہ کچھ طلبا آ گئے اور فاروق کے ہاتھ سے داخلے کا فارم لے کر خود بھرنے لگے کہ آپ غلط بھر دیں گے، تو پھر دوسرا فارم آپ کو ملے گا بھی نہیں۔ نام اور کلاس وغیرہ بھرنے کے بعد جو فاروق سے ان کی گفتگو ہوئی، وہ آپ بھی سُن لیجیے:

نمبر ۱: آپ کس ہوسٹل میں رہنا چاہتے ہیں؟

فاروق: ممتاز ہوسٹل میں۔

نمبر ۲: پھر تو پڑھ لیا آپ نے علی گڑھ میں۔

نمبر ۳: بھئی اتنے پیارے سے اور وہ بڑا دھاجو کڑی والا ہوسٹل ہے، پھنس جاؤ گے اس میں داخلہ لے کر۔ ذرا سوچ سمجھ لو، ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتاؤ!

نمبر ۴: اُدھر دوسی کے بھیجے ہیں یار یہ بے چارے کیا جانیں کہ کون سا ہوسٹل اچھا ہے اور کون سا بُرا۔

فاروق: جی بس یہی تو مجبوری ہے۔

نمبر ۱: یار میں تو منٹواسی (ع) لکھے دیتا ہوں یہ بھی کیا یاد کریں گے!

نمبر ۲: منٹواسی؟ کیا بات کرتے ہو، ہوش کی دوا کرو!

نمبر ۳: اناڑی ہے، بڑے بڑے نوابوں کے لڑکوں کو تو منٹواسی میں داخلہ ملتا نہیں ہے اور یہ چلا ہے انہیں داخل کرانے۔

نمبر ۱: (اپنی آنکھوں کو شوخی سے گھماتے ہوئے) ابے تم سب خاموش رہو۔ میں منٹواسی ہی لکھ رہا ہوں، تو کسی وجہ لکھ رہا ہوں۔ پچھلے سال بھی ایک لڑکے کا داخلہ کرا چکا ہوں، میں وہی ترکیب انہیں بھی بتا دوں گا۔

نمبر ۴: اگر ایسا ہو جائے، تو کیا کہنا، بے چارہ سکون سے پڑھ سکے گا۔

نمبر ۱: لیجئے فاروق صاحب فارم تو آپ کا بھر دیا گیا۔ اب منٹواسی ہاسٹل کے بارے میں دو چار الفاظ آپ کے گوش گزار کر دوں۔ رجسٹرار آفس والے آپ سے کہیں گے کہ کسی دوسرے ہوسٹل میں چلے جائیے، مگر آپ ہرگز راضی نہ ہوں، اس لئے کہ منٹواسی ہوسٹل میں یک نشستی کمرے ہیں اور فضا بہت ہی پُرسکون ہے۔

اس کے بعد سب کے سب فاروق کو لے کر اسٹریچی ہال گئے اور فارم جمع کرا دیا۔ دفتر والوں نے دوسرے روز صبح آٹھ بجے آنے کو کہا ہے اور فاروق واپس آنے لگے تو جس لڑکے نے فارم داخلہ پُر کیا تھا، کہنے لگا کہ منٹواسی میں کل بیس سیٹیں باقی رہ گئی ہیں

جب کہ درخواستیں اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ یونیورسٹی والے آپ کو ٹرخانے کی کافی کوشش کریں گے مگر آپ اپنی بات پر اڑے رہیں!

دوسرے روز پروفیسر غلام سرور صاحب پرووسٹ آفتاب ہال نے فاروق سے کہا کہ منٹواسی نام کا علی گڑھ میں کوئی ہوسٹل نہیں ہے، مگر فاروق ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر پروفیسر موصوف نے اس کے فارم پر جہاں منٹواسی لکھا ہوا تھا لال قلم سے انڈر لائن کر کے پرووائس چانسلر کی جانب بڑھا دیا جو اُن کے برابر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ پرووائس چانسلر نے فارم دیکھا اور کہا:

"آپ کون سے ہوسٹل میں داخلہ چاہتے ہیں؟"

فاروق: جناب منٹواسی میں۔

پرووائس چانسلر: منٹواسی نام کا علی گڑھ میں کوئی ہوسٹل نہیں ہے۔

فاروق: صاحب مجھے منٹواسی میں جگہ دے دیجئے، وہاں مجھے آسانی رہیگی۔

پرووائس چانسلر: آسانی کیا رہے گی؟

فاروق: اس ہاسٹل میں یک نشستی کمرے ہیں، پُرسکون ماحول میں پڑھائی ٹھیک سے ہو سکے گی۔

پرووائس چانسلر: آپ کو کسی شریر لڑکے نے بہکا دیا ہے، منٹواسی یونیورسٹی کا قبرستان ہے، ہوسٹل نہیں ہے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے منٹواسی کاٹ کر مارسین کورٹ لکھ دیا اور فارم فاروق کو دیتے ہوئے کہا کہ جائیے پیسے جمع کرا دیجئے۔ فاروق کھسیانا سا ہو گیا۔

ایک روز میں کلاس سے آ رہا تھا کہ ایک لڑکا میرے پاس آیا اور کہنے لگا مسٹر کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"بڑی خوشی سے۔ میرا نام محفوظ الحق ہے۔" میں نے کہا۔

"کون سے ہاسٹل میں رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
میں نے کہا "ڈے اسکالر ہوں۔"
اُس نے کچھ لڑکوں کی طرف جو کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے اشارہ کرتے ہوئے
کہا "وہ آپ کو بُلا رہے ہیں۔"
جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہی لڑکے جو فاروق کو پریشان کر چکے تھے
کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ سالار، سبطین، جنید اور محمود۔
"معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسی سال داخلہ لیا ہے؟" جنید نے کہا۔
میں نے یہ سوچ کر کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میں (NEW COMMER)
ہوں تو یہ پریشان کریں گے اس لئے میں نے انہیں بتایا کہ میں تو یہیں کا طالب علم ہوں۔
"کون سی کلاس کے؟" یہ سبطین کی آواز تھی۔
"سیکنڈ ایئر آرٹس" میں نے برجستہ جواب دیا۔
"مضامین کون سے ہیں؟" جنید نے پوچھا۔
"ہسٹری، اردو اور سوکس" میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔
سالار جو اب تک خاموش کھڑا تھا بولا "بڑے بھائی ہم سے مت چھپاؤ، سچ
سچ بتا دو۔"
"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں سوکس کون پڑھاتا ہے؟" جنید نے پوچھا۔
"ایں وہ پڑھاتے ہیں... ڈاکٹر مجید قریشی" میں ہکلایا
اس پر سب نے ایک قہقہہ لگایا اور جو لڑکا بھی نظر آیا اسے بلانا شروع کر دیا۔
"ارے میاں تحسین ان صاحبزادے کی سنتے جاؤ! انہیں ڈاکٹر مجید قریشی سوکس
پڑھاتے ہیں، ذرا قریشی صاحب کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی مبارکباد بھی دے دینا۔
(قریشی صاحب حساب کے پروفیسر تھے اور وہ ڈاکٹر نہ تھے) جعفری اور احمد علی کو

بھی آواز دی کہ بھیا ذرا ادھر آنا! میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ ؎
آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے
آن واحد میں دس پندرہ لڑکے جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک صاحب جن کے چہرے
پر باقاعدہ یک مشت و دو انگشت کی شرعی ڈاڑھی تھی سب کو خاموش کرتے ہوئے
آگے بڑھے اور بولے "بات کیا ہے جو بیچارے کو گھیرے ہوئے ہو؟"
جنید آگے بڑھ کر بولا "جناب کو ڈاکٹر مجید قریشی سوکس پڑھاتے ہیں!"
مولانا نے اوپر سے نیچے تک ایک نظر ڈالی اور فرمایا "آپ ہیں کس کلاس میں؟"
قبل اس کے کہ میں جواب دوں وہ سارے کے سارے ایک زبان ہو کر کورس میں
بولے "سیکنڈ ایئر میں۔"
"پھر تو ٹھیک ہی کہتے ہیں" مولانا بولے "اور جب یہ فورتھ ایئر میں آئیں گے تو
پالٹکس انہیں سرسید پڑھائیں گے۔"
اتنا کہہ کر مولانا تو چھوٹ لئے اور ان سب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔
ان طلباء کا مشغلہ ہی یہ تھا کہ چار چار یا پانچ پانچ کی ٹولیوں میں یہ نئے طلباء کی تلاش
میں گھومتے پھریں اور ان کو "پکڑ پکڑ" کر نت نئے طریقوں سے تفریح کا سامان فراہم
کریں۔ اگر کوئی سینیئر طالب علم ان لوگوں کو ٹوکتا تو یہ کہتے کہ "ہم تو ان لوگوں کو زندہ رہنے
کا قرینہ سکھا رہے ہیں۔"
علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لئے عزیز تھا کہ اس میں ہر ذوق
کی تسکین و تفریح کا سامان فراہم تھا۔ ہر شخص اپنے رنگ میں مست تھا۔ میں اطہر نفیس
کے پاس جاتا کہ جو بھی ذرا باہر ہو آئیں، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے "بیٹھو تو سہی" پھر کہتے
کہ سنو یار ظالم نے کس غضب کا شعر کہا ہے۔ ؎

کیا حُسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

جب میں پوچھتا کہ یہ شعر کس کا ہے تو اپنے خاص انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں: "قسم خدا کی محفوظ تمہارا بھی جواب نہیں۔"

ایک دن شام کو میں نصرت کے کمرے پر گیا، وہاں ایک اور صاحب تشریف فرما تھے، ان سے تعارف ہوا۔ وہ صاحب ایک طالب علم رشید عباسی کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے کہا: "ایک رشید عباسی کو تو میں بھی جانتا ہوں اور وہ محسن الملک ہوسٹل میں رہتے ہیں۔"

اُن صاحب نے کہا کہ "ہاں میں انہی عباسی کا ذکر کر رہا ہوں، اچھا آپ بھی اُن سے واقف ہیں؟" یہ کہہ کر انہوں نے بڑی گرم جوشی سے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ "آپ سے یہ مزید تعارف ہوا۔" کچھ وقفہ کے بعد نصرت صاحب نے مجھ سے کہا: "محفوظ صاحب آپ مسٹر چرچل کو جانتے ہیں؟"

میں نے عرض کیا: "کیوں نہیں کیا میں برطانیہ کے وزیراعظم کو بھی نہیں جانتا!"
اس پر انہوں نے فوراً میری طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا "ملائیے ہاتھ" یہ آپ سے مزید تعارف ہوا اور اس پر زوردار قہقہہ لگا۔

امتحانات قریب تھے ڈاکٹر عزیز (شعبۂ اُردو) نے اپنے لیکچر میں فرمایا کہ اب وقت آگیا ہے آپ لوگ اپنی تمام تفریحات کو بالائے طاق رکھ دیں اور تعلیم میں مصروف ہو جائیں۔ اردو کو عام طور سے طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو مادری زبان ہے۔ ایک رات میں پڑھ کر پاس ہو جائیں گے یا نہ بھی پڑھیں تو پاس ہونے کے نمبر تو آ ہی جائیں گے جو سراسر غلط ہے۔ دوسرے مضامین کی طرح آپ کو اُردو میں بھی خاصی محنت کرنی چاہیے۔ اگر آپ کو کوئی دشواری ہو تو آپ مجھ سے ہر وقت یہاں تک کہ گھر پر بھی آکر

پوچھ سکتے ہیں۔"

ایک روز شام کا وقت تھا کچھ اشعار میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے، چنانچہ میں کتاب لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر روانہ ہوگیا، دروازے پر دستک دی، جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اتنے میں اندر سے سقہ آیا میں نے اُس سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق معلوم کیا۔ اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اندر ہیں، لیکن ملازم کہیں باہر گیا ہوا، آپ اندر چلے جائیے، اندر زنان خانہ نہیں ہے۔ میں نے اس طرح جانا نامناسب سمجھا اور اس سے کہا کہ تم میری چٹ ڈاکٹر صاحب کو جا کر دے دو۔ اتفاق سے میرے پاس اس وقت کاغذ بھی نہ تھا۔ ادھر اُدھر نظر ڈالی کہ کہیں کوئی کاغذ کا پرزہ پڑا ہوا مل جائے لیکن بیکار۔ اچانک مجھے ایک ٹھیکری اور کوئلے کا ٹکڑا پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے کوئلے سے ٹھیکری پر اپنا نام لکھ کر سقہ سے کہا کہ جاؤ ڈاکٹر صاحب کو دے دو!

اُس نے واپس آکر کہا کہ آپ کو بلا رہے ہیں۔ کیا بتاؤں کہ ڈاکٹر صاحب کس شفقت سے پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ مجھے پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد میں نے اجازت لی۔ چلنے کو تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے وہ ٹھیکری مجھے واپس کرتے ہوئے مسکرا کر فرمایا کہ: "اپنا وزیٹنگ کارڈ تو لیتے جائیے!" میری حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ خدارا کوئی مجھے بتائے کہ نصیحت کرنے کا اس سے زیادہ دلکش اور دلچسپ پیرایہ ہو سکتا ہے؟ کہاں چلے گئے وہ شفیق اساتذہ کہ جن کی شفقت کے آگے ہم اپنے والدین کو بھول جایا کرتے تھے۔ کون ہے جو مولانا محمد علی جوہر سے واقف نہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مولانا علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ مسٹر جننگ ایک انگریز پروفیسر علی گڑھ چھوڑ کر پٹنہ کالج میں پرنسپل ہوگئے تھے۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ میں ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ تحریک عدم تعاون کا زمانہ تھا اور مولانا کی لیڈری اپنے پورے عروج پر تھی۔ اسی زمانے میں مولانا ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے پٹنہ پہنچے،

یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ مولانا پٹنہ جائیں اور اپنے شفیق استاد مسٹر ٹننگ سے نہ ملیں! چنانچہ وہ استاد کے بنگلے پر پہنچے۔ مسز ٹننگ نے استقبال کیا۔ ابھی مسز ٹننگ سے مصروفِ گفتگو تھے کہ مسٹر ٹننگ بھی تشریف لے آئے اور مولانا کو دیکھتے ہی دیوانہ وار ان پر برس پڑے۔ بیگم صاحب تو ششدر رہیں، مگر صاحب نے بے طرح سنائیں اور مولانا سے مخاطب ہو کر کہا: "میرا طالب علم اور وہ بھی تم سا ذہین، اور ذہانت اور قابلیت کا یہ مصرف!"

جتنا بیگم صاحب نے ٹھنڈا کرنا چاہا وہ اتنا ہی گرم ہوتے چلے گئے۔ مولانا چپ سادھے رہے اور آخر کار وہاں سے چلے آئے۔ ابھی مولانا کو آئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ دیکھا مسٹر ٹننگ چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی کہنے لگے: "محمد علی مجھے معاف کر دو، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں، میری آرزو تمہیں بڑے سے بڑے عہدے پر دیکھنے کی تھی۔ تمہاری یہ ہیئت دیکھ کر میں بالکل پاگل ہو گیا۔ محمد علی کہو کہو کیا تم نے مجھے معاف کیا؟"

"آپ میرے استاد ہیں آپ کا مجھ پر حق ہے۔" مولانا نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ استاد نے شاگرد کو گلے لگا لیا اور پھر دوبارہ اپنے گھر لے گئے۔

اسلامی ہفتہ منانا علی گڑھ کی قدیم روایات میں سے ایک ہے۔ یہ ہفتہ ہر سال بڑے احترام اور شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ میرے زمانے میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اس کے نگران ہوا کرتے تھے، جنہوں پہلے ہندوستان کے جید علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دے دی جاتی۔ اس سال مولانا عبدالماجد دریا بادی اور نواب بہادر یار جنگ تشریف لائے۔ جلسے کا اہتمام اسٹریچی ہال میں کیا گیا تھا۔ سامعین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اسٹریچی ہال میں اوپر نیچے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پہلے مولانا عبدالماجد تشریف لائے اور اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ مولانا کا مقالہ کچھ طویل ہو گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ طلبہ نے اپنی بے چینی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرنا شروع کر دیا۔ مولانا اس بات

کو تاڑ گئے اور مقالہ ختم کئے بغیر ہی بیٹھ گئے۔ صدرِ اجلاس ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے طلبہ کو جھاڑ پلائی اور پھر مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنا مقالہ مکمل فرمائیں لیکن مولانا تشریف نہ لائے۔ چنانچہ صاحبِ صدر نے قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ سے تقریر فرمانے کی درخواست کی۔ جلسے کا ماحول بڑا ہی خراب ہو گیا تھا اور ایک مقرر کے لئے بڑا ہی کٹھن وقت تھا، لیکن نواب صاحب کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ آپ ڈائس پر تشریف لائے اور بڑے ہی اطمینان سے یوں مخاطب ہوئے:

"حضرات اس سردی کے موسم میں آپ کی دعوت پر پانچ سو میل کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مولانا عبدالماجد نہیں ہوں کہ بیٹھ جاؤں گا۔ اچھی طرح سن لیجئے کہ جب تک ایک ایک لفظ نہ کہہ لوں گا، اسٹریچی ہال سے جاؤں گا نہ جانے دوں گا!"

نواب صاحب کی تقریر کیا تھی ایک سحر تھا کہ کسی کو ہاتھ ہلانے کا بھی ہوش نہ تھا۔ ایک جوار بھاٹا تھا جس میں پتھر لڑھکنے کے بجائے موتی رُل رہے تھے، ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی شخصیت بڑی ہی جاذبِ نظر تھی۔ دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، سرخ و سفید رنگ، مزاج میں شگفتگی، طبیعت میں سادگی، زبان میں فصاحت، گفتار میں مٹھاس، متقی اور پرہیزگار، قائدِ اعظم کے دستِ راست، مختصر یہ کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ سچ پوچھئے تو جو گناہ دکن کی سرزمین نے میر صادق کو جنم دے کر اپنے سر لیا تھا، اس کی تلافی اس نے نواب بہادر یار جنگ ایسے مجاہد کی شکل میں کر دی تھی۔

جب میں مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا، اس وقت ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کا تذکرہ سینئر طلبہ بڑے مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔

میں نے چھڑی والا واقعہ جو ڈاکٹر صاحب سے منسوب ہے، انہی طلباء سے سُنا تھا۔ اُن میں سے کسی نے یہ بھی سنایا تھا کہ ریاضی میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی ثانی نہیں اور کسی کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب نے (ZERO) کی VALUE پر ایک گھنٹہ تقریر کی تھی۔

میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی اپنی نیند کے اوپر حکمرانی ہے، یعنی جب وہ آدھ گھنٹے کے واسطے سونے کے لئے جاتے، تو تیس منٹ گزرنے پر خود بخود بیدار ہو جاتے۔ انہی طلباء نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کا دماغ اتنا مصروف رہتا ہے کہ ایک دفعہ اپنے ایک قریبی عزیز کو جو ڈاکٹر تھے، انہوں نے نہیں پہچانا اور کوئی غرض مند سمجھتے ہوئے یہ فرما دیا تھا کہ اس وقت میں مصروف ہوں آپ پھر آیئے گا۔ اور جب وہ صاحب جو خود بھی ڈاکٹر صاحب کی اس عادت سے واقف تھے مسکراتے ہوئے روانہ ہو گئے اور کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گئے، تو ڈاکٹر صاحب کا ملازم دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ صاحب اگر آپ فلاں صاحب ہیں، تو ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں:" اس پر وہ صاحب واپس آ گئے۔

میرے محترم ہیڈ ماسٹر محمد زبیر صاحب بڑے احترام سے ڈاکٹر صاحب کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام باتوں سے ڈاکٹر صاحب، اُن کی شخصیت اور اُن کی علمیت کے متعلق دل میں عقیدت و احترام کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور اُن کے دیکھنے کی آرزو تھی۔

مسلم یونیورسٹی میں جب فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا، تو اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے کی آرزو خداوند کریم نے پوری کی۔ دیکھا اور پورے چار سال دیکھا۔

لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد! ۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

درمیانہ قد، دوہرا بدن، رنگ بڑھاپے میں بھی سرخ و سپید، ڈاڑھی سفید، چھوٹی سی، مزاج میں سادگی، طبیعت میں بذلہ سنجی، چہرہ پُر وقار اور متانت کا مظہر۔ عقابی آنکھیں جو ان کی ذہانت کی غمازی کرتی تھیں۔ زبان نہایت سلیس۔ خدمت اُن کا شعار۔ سیاست اُن کا اوڑھنا بچھونا۔ الیکشن ان کا روز مرہ۔ بڑے سے بڑا حریف بھی منتظر زیر ہو کے رہتا تھا۔ اقتدار اُن کے قدم چومتا تھا۔ منتظم ایسے کہ جس ادارے کے سربراہ ہو جائیں، اُس کی انتظامیہ کا ایک ایک پرزہ نظر میں رکھیں۔ ہمدرد ایسے کہ اگر اُن کا بس چلتا تو دنیا جہان کی ساری آسائشیں سمیٹ کر مسلمانوں کے قدموں پہ ڈال دیتے۔ دیانت کے کوہ ہمالہ جی ہاں کوہ ہمالہ!

غور فرمایئے کہ باپ وائس چانسلر ہو اور بیٹا ایف اے میں چار سال فیل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے، تو ایک بیٹا کیا خاندان کے ہر فرد کو بیک جنبشِ ابرو ڈگریاں دلوا سکتے تھے، مگر مجھے یہ کہنے دیجئے کہ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے بس کا نہ تھا۔ بیٹا بلا سے فیل ہوتا رہے، لیکن اُن کی دیانت داری کو زک نہ پہنچے۔

رحم دل ایسے کہ ایک دفعہ دفتر والوں نے ایک چپراسی کی کسی اونچ نیچ پر اُسے ملازمت سے علیحدہ کرنے کا نوٹس ڈاکٹر صاحب کی منظوری کے لئے پیش کر دیا۔ آپ نے فوراً دفتر کے متعلقہ شخص کو بلا کر کہا کہ ایک بات ہمیشہ کے لئے نوٹ کر لیجئے کہ میرے قلم سے لوگ ملازم تو ہو سکتے ہیں، لیکن نکالے نہیں جا سکتے!"

ڈسپلن کی ہر قیمت پر حفاظت کرتے تھے پروفیسر پی اے خان ہمیں کتاب (CULTURE AND ANAHCHY) پڑھایا کرتے تھے اور اُن کا فرسٹ پیریڈ اسٹریچی ہال میں ہوا کرتا تھا۔ جنوری کی ایک صبح جب کڑاکے کی

سردی پڑ رہی تھی۔ پروفیسر صاحب کسی وجہ سے وقت پر تشریف نہ لائے۔ ہم طلبا ہال سے
باہر دھوپ میں کھڑے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے
آئے اور دور ہی سے فرمایا: "آپ لوگ یہاں کھڑے وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟
اگر کلاس نہیں ہے تو لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کیجیے!"

عرض کیا: "کلاس تو ہے، لیکن پروفیسر بی اے خاں صاحب ابھی تک نہیں
آئے ہیں۔"

یہ سن کر آپ نے طلبا کو اسٹریچی ہال چلے جانے کا حکم دیا۔ آگے آگے ڈاکٹر صاحب
تھے اور پیچھے پیچھے ساری کلاس۔ ڈاکٹر صاحب CULTURE AND ANARCHY
کے مصنف میتھو آرنلڈ کے بارے میں کچھ بتانے لگے۔ پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے
تھے کہ پروفیسر صاحب آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو جب انھوں نے کلاس لیتے ہوئے دیکھا
تو وہ ہال کے برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب نے انھیں دیکھا تو وہ
کلاس چھوڑ کر ان کے پاس آئے۔ ان سے کیا کچھ کہا یہ تو معلوم نہ ہو سکا، مگر جب
پروفیسر صاحب کلاس میں آئے، تو انھوں نے لیکچر دینے سے پہلے طلبا سے فرمایا:
"آپ لوگوں کو سردی میں بڑی زحمت ہوئی کہ میں وقت پر نہ پہنچ سکا جس کا مجھے
بہت افسوس ہے۔"

فوراً ہی چپراسی نوٹس لے کر آیا جس میں وائس چانسلر صاحب نے اسٹاف کو
تاکید فرمائی تھی کہ وہ وقت کی پابندی کیا کریں۔

"ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی عمر کا بڑا حصہ علی گڑھ میں گزرا۔
طالب علم، اسسٹنٹ پروفیسر، پروفیسر، پرنسپل، پرو وائس چانسلر،
وائس چانسلر اور آخر میں ریکٹر، غرض ہر حیثیت میں
وہ علی گڑھ سے وابستہ رہے اور وابستگی بھی ایسی کہ
اُن کو یہاں کے ذرّے ذرّے سے عشق تھا۔ یہ مشہور واقعہ
ہے کہ جب سر سید نے اُن کے ولایت جانے کو اس
امر پر مشروط کیا کہ وہ بعد تکمیل کم از کم تین سال ایم اے او
کالج کی خدمت کریں گے تو انھوں نے کہا کہ آپ تین
سال فرماتے ہیں، میں عمر بھر کالج کی خدمت کرنے
کو تیار رہوں۔"

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

کسی نے سچ کہا ہے کہ نیت ثابت منزل آسان! یہ ایک نیک نیتی تھی جس کے تقاضے سے ۱۸۷۵ء میں سر سید مرحوم نے علی گڑھ کی درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ ایک طرف قوم کی مخالفت اور نفرت اور دوسری طرف غیروں کی بدگمانی و شبہات۔ اس کے علاوہ مالی بے سروسامانی۔ لیکن اُس مردِ خدا نے تمام مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کیا اور خدا کا کرنا کہ وہ چھوٹی سی ابتدا جو اسکول کی صورت میں تھی آگے چل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی ہوئی۔ ہمارے ملک میں یونیورسٹیوں کی کمی نہیں اور آزادی کے بعد تو کہنا چاہیے کہ تقریباً ہر بڑے شہر میں ایک یونیورسٹی ہے، لیکن بعض اعتبار سے جو امتیاز علی گڑھ کے حصہ میں آیا وہ کسی کو نہ ملا۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

لوگ میری اس بات پر شاید ناک بھوں چڑھائیں، لیکن سچ پوچھئے تو اس میں مبالغہ نام کو نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ آرٹ اور سائنس کے بڑے بڑے ماہر اور علوم و فنون کے ڈاکٹر جیسے علی گڑھ نے پیدا کئے اور کسی نے نہیں کئے۔ دراصل علم ایک لیلےٰ ہے جس کے مجنوں نہ صرف علی گڑھ بلکہ دہلی، الٰہ آباد، لکھنؤ، کلکتہ، بمبئی، لاہور، ہر جگہ ملیں گے۔ پھر علی گڑھ کی شانِ امتیاز کیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بھارت دیش کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ یہی ہے۔ سچ پوچھئے تو ایشیا میں علی گڑھ اور افریقہ میں الازہر کو جو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ جامعہ ازہر کو ایک گونہ برتری اس

لحاظ سے حاصل ہے کہ اس کی عمر ایک ہزار سال کے بقدر ہے یعنی وہ اُس وقت عالمِ وجود میں آچکی تھی جب کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی عظیم درس گاہیں ہنوز پردۂ عدم میں تھیں۔ ہاں تو میں علی گڑھ کا ذکر کر رہا تھا کہ وہ عمر میں چھوٹی ہونے کے باوجود فخر کے ساتھ اپنی بڑی بہنوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہے۔ یہ اُس کی اس بین الاقوامی حیثیت کا ہی نتیجہ ہے کہ جب مشرقِ وسطیٰ اور متحدہ عرب جمہوریہ کے حکمران اور دانشور ہندوستان کا رُخ کرتے ہیں تو اُن کو اس مرکزِ علمی کی سیر کے لئے خاص طور پر دعوت دی جاتی ہے۔

دوسری بات جس پر علی گڑھ بجا طور سے ناز کر سکتا ہے یہ ہے کہ ابتدا سے لے کر آج تک اس کے اساتذہ اور تلامذہ میں ایک خاصی تعداد غیر مسلم اصحاب کی بھی رہی ہے۔ اس رواداری کا اثر ہے کہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ علی گڑھ کے غیر مسلم اولڈ بوائز، جیسے راجہ مہندر پرتاپ، اب بھی جب قدیم دنوں کو یاد کرتے ہیں، تو آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہیں۔ تیسری بات جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو حضرات علی گڑھ کی زندگی کا صحیح نمونہ ہیں اُن کو آپ ہر شعبۂ زندگی میں کامیاب پائیں گے۔ وہ ایک طرف قوم و ملت کے عاشق ہوں گے، تو دوسری طرف ملک و وطن کے شیدائی۔ ایک علیگیرین نے درست کہا تھا کہ علی گڑھ کا امتیازی نشان یہ ہے کہ علی گڑھ والوں کو کیسے ہی حالات میں رکھ دو، وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق اور ہو سکا تو حالات کو اپنے مطابق بنا لیں گے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم ایک دفعہ فرماتے تھے کہ مجھے ایک سرکاری کمیشن میں سر اینڈرسن کے ساتھ ایک دور افتادہ پہاڑی مقام پر ٹھہرنا پڑا۔ شام ہو گئی تھی اور قرب و جوار میں کوئی عمارت ڈاک بنگلے کے سوا نہ تھی اور ڈاک بنگلے میں کوئی متنفس چوکیدار کے سوا نظر نہ آیا۔ ہم لوگوں کو دن بھر کی تکان سے سخت بھوک لگی ہوئی تھی لیکن وہاں دور دور کھانے کا نام نہ تھا۔ انگریز رفیقِ سفر نے مجھ سے کہا: "ڈاکٹر، تم کہتے ہو کہ علی گڑھ کے آدمی پر کسی کا گھر بند نہیں ہوتا۔ تب جانیں کہ اس وقت چائے

یا کھانے کا کوئی بندوبست کرو!

میں نے کہا، "دیکھئے کوئی بندوبست ہو جاتا ہے۔" خدا کا کرنا تھوڑی ہی دیر نہ گزری تھی کہ چوکیدار نے آکر کہا کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، چنانچہ اُن کو بلا لیا گیا۔ آنے والے ایک علیگ تھے جو قریب کی کسی تحصیل میں تحصیلداری کے عہدے پر مامور تھے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ اُن کو ہمارے آنے کی خبر کیوں کر ہوئی؟ تو انہوں نے بتایا کہ اُن کو اخبارات سے ہماری آمد کا علم ہوا تھا۔ اُن سے دریافت کیا گیا کہ اس وقت چائے کا انتظام ہو سکتا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ نہ صرف سماوار اور چائے کا پورا سامان، بلکہ لذیذ اور پُرتکلف کھانا بھی لے کر آئے ہیں، چنانچہ اس بھوک میں کھانے کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ میں نے سر مینڈرس سے کہا کہ دیکھئے آپ نے علی گڑھ کی کرامت! جس کا انہوں نے بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خدا کے فضل سے بہت سے اداروں، فیکلٹیوں اور شعبوں پر مشتمل ہے جن کی عمارت کا رقبہ کئی میل پر محیط اور جن کی مالیت کا تخمینہ ایک کروڑ سے متجاوز ہے۔ مگر حقیقت امر یہ ہے کہ عمارتیں اور ادارے بذاتِ خود چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل اہمیت اُن افراد کی ہے جو وہاں سے تعلیم و تربیت پاکر کارزارِ حیات میں داخل ہوتے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس میدان میں ناکامی سے دوچار نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر ہم صرف چند فرزندانِ علی گڑھ کے نام گنائیں گے جن کے اکتسابات و کمالات کا اعتراف نہ صرف اہلِ وطن بلکہ ممالکِ غیر نے بھی کیا ہے:

اگر آپ علی گڑھ کی کسی علمی مجلس کی طرف ہو گزریں تو وہاں آپ کو ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور خواجہ غلام السیدین کے عالمانہ خطبات کی گونج سنائی دے گی۔ اگر بزمِ شعر و سخن میں جا نکلیں، تو ظفر علی خاں، حسرت، فانی، سردار جعفری، مجاز اور جذبی کے نغمے فردوسِ گوش ہوں گے۔ سیاست کے میدان میں جانا ہو، تو وہاں محمد علی، شوکت علی،

رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی ہستیاں ملیں گی۔ ادب و صحافت میں میر محفوظ علی، رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالغفار کی بذلہ سنجیاں روتوں کو ہنسائیں گی۔ یہ گنتی کے صرف چند نام تھے جو بروقت خیال میں آئے، ورنہ علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی نے ہر عہد میں ہر فن کے ایسے کاملین پیدا کئے جن پر ہم بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں۔

آج کی صحبت میں جی چاہتا ہے کہ گذشتہ ربع صدی کی خاص خاص شخصیتوں کے بارے میں جنہوں نے کسی نہ کسی پہلو سے علی گڑھ کی زندگی میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں، اظہارِ خیال کیا جائے۔ یہ جائزہ کسی حیثیت سے بھی جامع نہیں کہا جا سکتا۔ صرف چند گزری ہوئی یادیں اور تاثرات ہیں جن کو سپردِ قلم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صرف دو شخصیتوں کے خاکے پیش کئے جا رہے ہیں، میری مراد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ہے۔

کنبوہ خاندان جس کے افراد میرٹھ، بریلی اور مارہرہ میں بہ کثرت ہیں، اپنی ذہانت اور لیاقت کے لئے مشہور ہے۔ شاذونادر کوئی فرد ہوگا جو دانائی اور ہوشیاری میں یکتا نہ ہو۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ علی گڑھ میں گزرا۔ طالب علم، اسسٹنٹ پروفیسر، پرنسپل، پرو وائس چانسلر، وائس چانسلر اور آخر میں ریکٹر۔ غرض ہر حیثیت میں وہ علی گڑھ سے وابستہ رہے اور وابستگی بھی کیسی کہ کہنا چاہئے کہ اُن کو یہاں کے ذرّے ذرّے سے عشق تھا۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب سر سید نے اُن کے ولایت جانے کو اس امر پر مشروط کیا کہ وہ بعد تکمیل کم از کم تین سال علی گڑھ ایم اے او کالج کی خدمت کریں گے تو انہوں نے کہا کہ "آپ تین سال فرماتے ہیں میں عمر بھر علی گڑھ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔" جس پر خوش ہو کر سر سید نے وہ شرائط نامہ چاک کر دیا۔ درحقیقت اس اولوالعزم انسان نے جو کچھ کہا تھا وہ کر دکھایا ؎

جان دی آپ کے دروازے سے مرکر اُٹھے

اور سچ پوچھیے تو مر کر بھی انہوں نے علی گڑھ کی خاک دامن گیر کو نہ چھوڑا۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے، اُن کا بیان ہے کہ موصوف اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی دانائی سے پچاس برس آگے کی بات سوچ لیتے تھے اور اُس کے تدارک میں مصروف ہو جاتے تھے۔

علی گڑھ کی محبت کا ایک واقعہ اوپر گزرا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ جب وہ کچھ عرصے کے لئے علی گڑھ سے علیحدہ ہو گئے اور مرکزی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی میں قیام اختیار کیا، اس زمانے میں جب کوئی علی گڑھ کا طالب علم آ نکلا، خواہ ڈاکٹر صاحب اُس کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، صرف اس قدر کافی تھا کہ وہ اُن کی مادرِ درس گاہ کا فرزند ہے، بس ڈاکٹر صاحب اُس کی مدد کو کمربستہ ہو جاتے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے بڑے سے بڑے افسر کے پاس اُس کی سفارش کے لئے پہنچ جاتے۔ لاکھوں باتوں کی ایک بات یہ تھی کہ ہمارے علم میں انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ یہاں تک کہ اُن اساتذہ کے ساتھ بھی جو وقت بے وقت ڈاکٹر صاحب پر اعتراض کرتے تھے موقع آنے پر اچھا ہی سلوک کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں جزرسی اور کفایت شعاری بدرجۂ کمال تھی وہ ابتدائے ملازمت سے آخر عمر تک اپنے اخراجات کی پائی پائی کا حساب لکھتے تھے مزاج میں سادگی اور بے پروائی انتہا کی تھی چوں کہ ایک زمانے میں وہ غریب ماحول میں رہ چکے تھے اس لئے غریب مسلمان قوم کے بچوں کی مشکلات کا اُن کو پورا پورا اندازہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو شعر و ادب سے کبھی ذوق نہیں رہا اور ہونا بھی نہیں چاہتے تھا کیونکہ ریاضی اور ادب کا کوئی جوڑ نہیں۔ اُن کے بعض ساتھی جن کو اُن کی غیر معمولی ذہانت کا ذاتی تجربہ تھا کہتے تھے کہ اگر ڈاکٹر صاحب سیاست میں نہ پڑتے اور ریاضیات ہی پر اپنی پوری توجہ

صرف کرتے تو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوتے۔

موصوف کی سیرت کا ایک عجیب پہلو یہ تھا کہ اکثر روز کے آنے والوں کو بھی بھول جاتے اور اُن کا نام دریافت کرتے کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ ان کا صحیح نام یاد رکھتے ہوں۔ لوگوں کو حاشیہ چڑھانے کا شوق ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے مشہور کر دیا کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے داماد اُن سے ملنے آئے، تو ڈاکٹر صاحب ان سے بے ساختہ پوچھ بیٹھے "آپ کا نام؟" بعض نے یہاں تک اُڑا دی کہ ڈاکٹر صاحب باہر سے آئے۔ کمرے میں پہنچ کر چارپائی پر اپنی چھڑی لٹا دی اور خود کونے میں چھڑی کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ لیکن ادھر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ سونے اور جاگنے کے اوقات پر اُن کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ کسی میٹنگ سے جس میں کوئی طویل نہ ختم ہونے والی بحث چھڑی ہوئی ہے یہ کہہ کر اُٹھے کہ میں سات منٹ میں آتا ہوں۔ فوراً ریٹائرنگ روم میں چلے گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ واقعی سو رہے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں۔ ساتواں منٹ ختم نہیں ہوا تھا کہ اُٹھ بیٹھے اور بدستور مذاکرات میں شریک ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے کارنامے گنانا میری بساط سے باہر ہے اور میرے فرائض سے بھی خارج۔ تاہم اُن کے آخری کارنامے کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کا میڈیکل کالج ہے جس کو وجود میں لانے میں صرف ڈاکٹر صاحب کی ذاتی بصیرت اور اُن کے رفیقِ کار ڈاکٹر ہادی حسن کی عملی کوشش کو دخل ہے۔ اُن کے احسان سے ہماری قوم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

علی گڑھ نے جن نامور اور ذی مرتبت شخصیتوں کو پیدا کیا ہے اُن میں ذاکر صاحب کی ہستی نہایت جاذبِ نظر اور اہم ہے۔ قائم گنج، ضلع فرخ آباد پٹھانوں کی بستی ہے جو اپنی شورش پسندی کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے اور جس کے افراد تقسیمِ ملک سے پہلے تک فوج میں ممتاز عہدوں پر مامور رہے ہیں، لیکن ذاکر صاحب کا گھرانا اپنے علمی

اکتسابات کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ اُن کے ایک بھائی ڈاکٹر محمود حسین پاکستان میں ایک ذمہ دار خدمت پر فائز ہے۔ دوسرے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اپنے اعلیٰ ادبی ذوق اور اسلامی خیالات کے لحاظ سے ملک کے مایۂ ناز افراد میں شمار ہوتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی تعلیم اٹاوہ، علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور جرمنی میں ہوئی اور یہ مسلّم حقیقت ہے کہ وہ دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کے اعتبار سے اُن لوگوں میں ہیں جن پر ملک و ملت کو فخر ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جامعہ ملیہ کی کشتی کو اُس زمانے میں سہارا دیا جب کہ وہ حوادث کے طوفانوں میں گھری ہوئی تھی اور اس پر حکومت کی کڑی نظریں پڑ رہی تھیں۔

اُن کے ایثار کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس وقت جب کہ اُن کو دوسری یونیورسٹیاں گرانقدر مشاہروں پر اپنے یہاں دعوت دے سکتی تھیں انہوں نے ایک قلیل مشاہرہ پر جامعہ میں رہنے کو ترجیح دی اور یقیناً یہ اُن کی اور اُن کے چند مخلص رفقاء کی قربانیوں کا ثمرہ تھا کہ ادارہ مذکور نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھ سکا بلکہ علم و عمل کی شاہراہوں پر استقلال سے گامزن رہا۔

میں جامعہ کے بعض اساتذہ نے بتایا ہے کہ کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا تھا کہ اُن کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی اور ان باہمت افراد کو اپنے متعلقین کے ساتھ محض آلو اُبال کر کھانا پڑتے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد شکر ہے کہ جامعہ کی حیثیت حکومت نے تسلیم کی اور اس کی مالی حالت مستحکم ہو گئی۔

جامعہ ملیہ کا پورا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے اور ہمیں بجا طور پر اس کے موجودہ ارباب حل و عقد سے توقع ہے کہ وہ سیکولرزم کے دور میں اس اہم ادارے کی اسلامی خصوصیات کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں گے!

جامعہ کی خدمت کے بعد ذاکر صاحب اپنی محبوب درس گاہ، یعنی علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ وہ زمانہ حقیقتاً پُر آشوب تھا۔ اکثریت اور حکومت کی علی گڑھ پر کڑی نظریں پڑ رہی تھیں اور ہر کوئی اس کی سربراہی کا نازک فرض ادا کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ ذاکر صاحب نے مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر یہ خدمت قبول کی جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ اُفق پر شکوک و شبہات کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ بڑی حد تک چھٹ گئے "ہم نفسانِ رفتہ" میں رشید احمد صدیقی صاحب نے درست فرمایا ہے کہ:

"مولانا ابو الکلام آزاد ان تحریکوں (علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی) کی تائید میں نہ تھے۔ یونیورسٹی جن شرائط پر یا جن حالات میں قبول کی گئی اُس کے خلاف مولانا کی لکھنؤ میں جو تقریر ہوئی اور اس پر جو مضامین انہوں نے سپرد قلم کئے وہ کچھ اور نہیں تو بے مثل خطابت شدید طنز اور اعلیٰ انشاپردازی کے اعتبار سے اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے لیکن تقسیم ملک کے بعد جب حالات دگرگوں ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو ہر گزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں وہ بھی اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ اُن میں سے ایک ذاکر صاحب کو علی گڑھ کی وائس چانسلری قبول کرنے پر آمادہ کرنا بھی تھا۔ حالات و حادثات کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ذاکر صاحب اور مولانا دونوں علی گڑھ کے خلاف تھے، لیکن وقت آیا تو ان ہی دونوں کو اس کی حمایت اور حفاظت کے فرائض ادا کرنے پڑے "بت خانے" کی یہ کرامت کیا کم ہے! ع

کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

ایک مرتبہ سرسید ڈے کے موقع پر یونیورسٹی کے ایک زندہ دل تاریخ کے پروفیسر تقریر کر رہے تھے "سرسیّد بحیثیت مورّخ" وہ اس موضوع پر تقریر کرتے

ہوئے سررشتہ کی کوتاہیوں کا ذکر بڑی تندہی سے کر رہے تھے جب وہ تقریر ختم کر چکے تو ذاکر صاحب کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ "میری تمنا ہے کہ ایک فرد واحد نے جتنا بڑا کام انجام دیا ہے پورا شعبۂ تاریخ اس قسم کا کام ان تمام کوتاہیوں کے ساتھ کرے تو میں سمجھوں گا کہ اس نے بڑا کام انجام دیا۔"

اسی طرح انگریزی کے ایک سیمینار میں جب ذاکر صاحب صدارتی تقریر کرنے کھڑے ہوئے، تو فرمانے لگے کہ "میں شعبۂ انگریزی کا کارنامہ خیال کروں گا کہ اس کا کام مکمل ہو گیا، اگر وہ طلبار کو صرف یہ سکھا دے گا کہ (YOURS FAITHFULLY) میں "S" کسی طرح درست نہیں ہے۔"

ذاکر صاحب کی نظری اور عملی سیاست کی موافقت یا مخالفت میں اہل سیاست ہی اظہار رائے کر سکتے ہیں، لیکن یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ نہ صرف ملتِ اسلامیہ، بلکہ ہند و پاکستان میں ممتاز علمی درجہ اور تعلیمی بصیرت رکھتے تھے ان کی تقریر و تحریر اس قدر جچی تلی شستہ اور رفیع ہوتی کہ اگر اس کو ادبیت کا شاہکار کہیں تو بے جا نہیں۔ اس کے ساتھ اُن کا مزاج بھی نہایت لطیف اور پاکیزہ تھا۔ پرائیویٹ صحبتوں میں وہ کبھی کبھی بڑے پُرلطف بلکہ شوخ فقرے کہہ جاتے۔

یوں تو موصوف کو ہر علمی اور تعلیمی ادارے سے دلچسپی اور محبت تھی، لیکن جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی دو ایسے ادارے ہیں جن سے اُن کو نہایت شغف بلکہ عشق تھا۔

موجودہ دور ابتلا میں جب مسلم یونیورسٹی کو اپنی تاریخ کے سب سے شدید اور نازک امتحان سے گزرنا پڑا۔ علی گڑھ کے بہی خواہوں کو یہ بجا توقع تھی کہ موصوف اپنی اعلیٰ قابلیت اور گرانقدر منصب کے اثرات سے کام لے کر کوئی ایسا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو نہ صرف ارباب حکومت کی ذاتی ہٹ کو تسکین دیتا ہو، بلکہ ملت کے تمام افراد کیلئے قابل قبول ہو۔ ان کی اسٹریچی ہال کی ایک تقریر آج تک

کانوں میں گونج رہی ہے اور سننے والے پھر اس صدائے عزیمت کے سننے کے مشتاق ہیں۔ یہ وہ موقع تھا کہ پریس کے بعض اہل غرض اشخاص نے علی گڑھ کے خلاف بہت کیچڑ اچھالی تھی اور علی گڑھ کا ہر بہی خواہ اس پروپیگنڈے سے آزردہ خاطر تھا۔ جلسے کے مہمانِ خصوصی اچاریہ ونوبا بھاوے تھے۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے نہایت جرأت اور حق پرستی سے علی گڑھ کی وکالت کرتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے اُن کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ "جھوٹے اور بدزبان ہیں وہ پریس اور وہ افراد جو محض تنگ نظری سے علی گڑھ پر بے بنیاد الزامات لگانا اپنا دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ معصوم چہرے اور یہ بے ضرر ہستیاں کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہیں جو کسی لحاظ سے بھی ہمارے ملک کے لئے نقصان کا باعث ہو۔"

رشید احمد صدیقی صاحب نے مولانا آزاد کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"قطع نظر اس سے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہو گئے تھے، اس سے باہر نکل سکتے بھی تھے یا نہیں، ان کو نکلنے دیا بھی جاتا یا نہیں یا ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی، کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ کاش وہ حکومت کے محدود اور محو افتخار حلقے سے باہر نکل کر جمہوریہ ہند کے دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن محترم باالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا حق ہے اور ذمہ داری بھی۔ جی ایسا کیوں چاہتا ہے، شاید اس لئے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دور دور ایسا نظر نہیں آتا جس کے سپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جا سکے ؎

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی"

اگرچہ رشید صاحب کا یہ قول مولانا آزاد کے لئے ہے، مگر اس دور میں ذاکر صاحب کی طرف بار بار نظر اٹھتی ہے۔

"صبح ہوتے ہی ہوسٹل میں چہل پہل پیدا ہو جاتی تھی۔ عام طور پر ہم لوگ بہت سویرے بیدار ہو جاتے تھے۔ میرے بھائی بڑے سخت گیر اور ضابطہ پسند انسان تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے میری مجال نہ تھی کہ نماز فجر سے محروم ہو جاؤں۔ غسل کے بعد ہم لوگ ڈائننگ ہال کی جانب یورش کرتے تھے یہاں سب کے سامنے ایک ہی قسم کا ناشتہ ہوتا تھا۔ مکھن اور علی گڑھ کے نہایت ہی لذیذ اور غذائیت سے بھرپور بسکٹ اور چائے۔ ہوسٹل کا ڈائننگ ہال علم مجلس کی ایک تربیت گاہ بھی ہوتا تھا۔ مجلس اور مجمع میں آدمی کیسے بیٹھے کیسے اٹھے اور کس طرح ماکولات اور مشروبات سے اپنے کام و دہن کو نوازے"

شاہ حسن عطا

دلی میں مغلوں کی اندر سبھا کے اجڑنے کے بعد جب علی گڑھ میں سید احمد خاں نے علم و دانش کی بزم ترتیب دی، تو اس کا تعلق کسی خاص طبقے سے نہ تھا۔ علی گڑھ کے دروازے تمام طبقوں، جھولوں، ذاتوں اور لسانی حلقوں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ وہاں جنوبی افریقہ کے مومنان مُفلک نام بھی تھے۔ شرانکورا اور کوچین کے عرب نژاد نوجوان بھی تھے، حیدرآباد کے خوش تمیز اور خیروالی پوش نواب زادے بھی تھے، دلی کے خوشحال متمول گھرانوں کے افراد بھی تھے۔ یوپی کبھی اور بہار اور بنگال کے تمام اہم اضلاع اور قصبات کے شریف زادے بھی تھے اور انتہائی غریب اور مفلوک الحال خاندانوں کے ذہین سپوت بھی جنہیں انجمن قرض حسنہ کی جانب سے قرض ملتے تھے اور وہ اسی قرض سے اپنی تعلیم مکمل کرتے تھے۔ علی گڑھ میں ایک بات اور تھی، وہاں ہر علاقے کے اساتذہ تھے اور ہر استاد اپنے فن میں ماہر کامل تھا عربی کے شعبے کی سربراہی علامہ عبدالعزیز میمن کو حاصل تھی۔ مجھے خوب یاد ہے میں نے کہیں پڑھا تھا، لیکن یہ یاد نہیں کہ کہاں پڑھا تھا بقول سعدی ؎

"ندانم کجا دیدہ ام در کتاب"

کہ مشہور مستشرق نکلسن نے مولانا کے لیے لکھا ہے کہ مولانا دنیا میں جاہلی شاعری کے سب سے بڑے عالم ہیں۔"

مرحوم ڈاکٹر ہادی حسن تھے۔ نواب محسن الملک کے بھتیجے، جو فارسی ادب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور جن کی بے مثل خطابت انہی کے ساتھ دفن ہو گئی۔

مرحوم پروفیسر شریف تھے جو فلسفۂ جدید و قدیم کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ نفاست
اور خوش ذوقی کی ایک آیت تھے کیسے کیسے باکمال لوگ عظیم لوگ علم و دانش کے پرستار
لوگ، ملکوتی صفات لوگ، افسوس سے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

علی گڑھ کے اس علم پرور ماحول میں زندگی کے پانچ چھ سال میں نے گزارے۔
تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جون ۱۹۴۳ء میں جب میں نے اپنی ہائی سکول کی نمایاں
کامیابی کی خبر سنی تو بے ساختہ میرے دل میں یہ آرزو جاگ اٹھی کہ میں مزید تعلیم کے لئے
علی گڑھ چلا جاؤں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر علی گڑھ جانے اور وہاں سے
فیضیاب ہونے کا ایک قدرتی داعیہ پہلے سے موجود تھا۔ میں نے ہائی اسکول رائے بریلی
سے کیا تھا۔ لکھنؤ رائے بریلی سے قریب تھا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے میرے بعض اعزہ
تعلق بھی رکھتے تھے، مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی جانے کے لئے کبھی بھی
سوچا ہو۔ انہی دنوں میری بڑی بہن جن کے نام پر میں نے اپنا شعری مجموعہ "حریر سنگ"
معنون کیا ہے ہم سب کو داغ مفارقت دے گئیں اور گھر کی فضا اس حادثے کی وجہ
سے غم آلود ہو گئی۔ میرے والدین چاہتے تھے کہ میں ان سے بہت زیادہ دور نہ جانے
پاؤں، آج سے بیس بائیس سال پہلے رائے بریلی سے لکھنؤ اور علی گڑھ تک جانا بھی گویا
بہت دور چلا جانا تھا۔ اسی حیص بیص میں میرا داخلہ لکھنؤ کے ایک مشہور کالج "جوبلی کالج"
میں ہو گیا۔ "جوبلی کالج" میں صرف ان طلبا کو داخلہ ملتا تھا جن کی تعلیمی حالت بہت اچھی
ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی عمر کے جو سال میں نے اس کالج میں گزارے وہ میرے
لئے ناقابل فراموش ہیں۔ میرے اساتذہ بہت اچھے، بہت قابل اور بے حد متین لوگ
تھے، مگر ایک بات ضرور تھی جسے میں شدت سے محسوس کرتا تھا کہ یہ اساتذہ اچھی تعلیم

دینے کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبا میں سیاسی رجحانات کے فروغ پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے
تھے اور ہر ممکن طریقے سے ہندو دانشوروں، فلسفیوں، مورخوں اور سیاستدانوں کی عظمت
کے نقوش ہمارے ذہنوں پر مرتسم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک
کے عرصے میں ایک بار بھی کسی مسلمان اہل علم کو اس کالج میں مدعو نہ کیا گیا۔ اسی طرح
مباحثوں اور مناظروں میں ان طلبا کو داد ملتی تھی جو خالص مہاسبھائی انداز میں اپنے سیاسی
عقائد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ اس فضا میں رہتے ہوئے میں نے بڑی گھٹن محسوس کی،
یہ گھٹن کچھ اس لئے نہ تھی کہ کالج میں میرے ساتھ کوئی ناروا سلوک ہوتا تھا یا یہ کہ پڑھانے
والے پڑھانے میں دلچسپی نہ لیتے تھے، حقیقت یہ تھی کہ کالج کا ماحول خالص تعلیمی اور علمی
تھا اور میں کالج کے سب سے بہتر طالب علموں میں تھا، انٹر کے پہلے سال کے سالانہ
امتحان میں میری پوزیشن آئی تھی اور صف میں ہی فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا تھا،
لیکن میں پھر بھی غیر مطمئن تھا۔

میرے بڑے بھائی مرحوم شاہ ہادی عطا انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں یوپی میں
دوسری پوزیشن حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ چلے آئے تھے۔ میں اور وہ ایک مدت
سے ساتھ تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک درجے میں وہ اول آئے اور اس سے پہلے کے
درجے میں میں اول آیا۔ یہ سلسلہ مدتوں سے جاری تھا۔ اب میرے لئے ذہنی طور پر
علی گڑھ سے باہر رہنا اور بھی ممکن نہ رہا۔ انٹر کا سال دوم میں نے رو رو کے کاٹا۔
میرے بھائی جس وقت علی گڑھ کی وضع کی کالی اچکن پہن کر لکھنؤ آتے اور میں ان کی
زبان سے آفتاب ہوسٹل، ایم ایم ہوسٹل، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر ہادی حسن،
پروفیسر حبیب، یونین ہال، اسٹریچی ہال، شمشاد بلڈنگ، راحت منزل، نواب چھتاری اور
میرس روڈ کے نام سنتا تھا تو جیسے میرا دل سینے میں دھمکتا تھا۔

میرے بڑے بھائی مجھے علی گڑھ سے برابر خطوط لکھتے رہتے اور ان میں وہاں

جانے سے پہلے ہی ذہنی طور پر وہاں پہنچ چکا تھا۔ سیاسی حالات کا رُخ روز بروز بدلتا جا رہا تھا۔ دوسری بڑی جنگ دم توڑ رہی تھی۔ قدریں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ نوجوان ہر جگہ ایک خلش سی محسوس کر رہے تھے۔ آخر وہ ساعت بھی آ ہی پہنچی جب میں علی گڑھ کے لئے عازمِ سفر کر بیٹھا۔ میرے بڑے بھائی مرحوم میرے ہم سفر تھے۔ یہ جولائی ۱۹۴۵ء کی ایک بارانی شام تھی۔ میرے والد ماجد جو اس وقت ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث تھے، میرے بھائی کو بار بار میرے بارے میں بے شمار ہدایات دے رہے تھے۔ میرے پاس، یعنی میرے تعلیمی اعمالنامہ میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ دونوں کے فرسٹ کلاس سرٹیفکیٹ تھے۔ سینے میں ہزار ہا آرزوئیں، تمنائیں اور امنگیں تھیں۔

لکھنؤ سے علی گڑھ تک کم از کم ان دنوں آٹھ گھنٹے کا راستہ تھا، چنانچہ یہ راستہ جوں توں طے ہو گیا۔ ہم جاگ کر سوتے رہے اور سو سو کر جاگتے رہے۔ کئی بار غالباً کلھڑوں میں چائے پی گئی اور یوں مسافرانہ نیند پر زبردستی قابو پایا گیا۔ کوئی چار بجے صبح علی گڑھ اسٹیشن آ گیا ــــ ایک تو ساری رات کی تھکن اور بقول غالب "دمِ میر ارمان میرا عریان جوا" دل اور اس پر طرّہ یہ کہ اسٹیشن پر مجھے کسی پرانے مقبرے کا گمان ہوا۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی، تو کبوتروں کے غول کے غول دیکھے۔ کوئی پوچھے کہ یہ کبوتر علی گڑھ اسٹیشن پر کب سے قابض ہیں، اور کیوں قابض ہیں؟ تو کوئی کیا جواب دے گا، مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے اس معاملے میں علی گڑھ اسٹیشن کو منفرد پایا۔

مجھے علی گڑھ سے آئے ہوئے ستر سال ہو چکے ہیں، مگر یہ کبوتر مجھے اب تک یاد ہیں۔ میرے لئے یہ کبوتر کبوترانِ حرم سے کم مقدس اور محترم نہیں۔ یہ منظر تو خیر بجانب عرش تھا فرش پر بھی ایک منظر دیدنی تھا۔ مجھے جا بجا سفید اچکنوں میں اور ترکی ٹوپیوں میں کچھ لوگ متحرک نظر آئے۔ یہ یونیورسٹی کے بُل (BULLS) تھے، یعنی یونیورسٹی کے فرشتگانِ عذاب یہ طلبا کی مدد کرتے تھے۔ نوواردوں کو راستہ بتاتے تھے اور

حسبِ ضرورت اُن سے بازپرس بھی کر لیتے تھے۔ ان بُلوں کی موجودگی میں طالب علم کے لئے کسی خفیف الحرکتی کا مرتکب ہونا ممکن نہ تھا۔

تھوڑی دیر میں ایک دقیانوسی تانگے نے جس کے ہچکولے میرے لئے کم از کم اب تو بلائے جان ثابت ہوں۔ مجھے اور میرے بھائی جان کو سلطان جہاں منزل پہنچا دیا۔ مچھروں کی خوفناک یورش کے باوجود میں اپنے اوّلین میزبان کا نام جانے بغیر نیند کی بوجھل جھیل میں ڈوب گیا۔

نوواردوں کو علی گڑھ میں بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان آزمائشوں کو رستم کی "منزلِ ہفت خواں" یا عطار کے "ہفت شہرِ عشق" کہنا قطعاً شاعرانہ مبالغہ نہ ہو گا۔ کتنے ہوتے تھے جو ان منازل اور آزمائشوں کے تصور ہی سے فرار ہو جاتے تھے۔ ان میں ایک منزل یونیورسٹی میں داخلے کی ہوتی تھی۔ اسٹریچی ہال میں مختلف ہالوں کے پراووسٹ (PROVOST) بصد شانِ جلال جلوہ افروز ہوتے تھے۔ ان کے نائبین، میر منشی اور محاسب سب ان کے جلو میں ہوتے تھے۔ طلبار کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہوتا تھا جو پراووسٹوں کی جانب رخ کیا کرتا تھا۔ پراووسٹوں کے حضور میں پچھلی تعلیمی زندگی کا محاسبہ، اسناد کا معائنہ، مستقبل کے بارے میں مباحثہ اور تھوڑا سا مناظرہ سب کچھ وقوع پذیر ہو جاتا تھا۔

جن طلبار کے ساتھ پہلے سے کوئی نہ ہوتا تھا، انہیں کوئی نہ کوئی خضرِ راہ مل جاتے تھے، یعنی چند سینیر طلبا جو علی گڑھ کے بہت سے ذور دیکھے ہوئے ہوتے تھے اور فنِ سخن طرازی میں ید طولیٰ بھی رکھتے تھے۔ ان لاوارثوں کو اپنی رہنمائی میں لے لیتے تھے، اور یہ بیچارے بہ حالتِ مجبوری اپنی عقل کو ان کی عقل کا تابع کر دیتے تھے اور مضامین تک کے انتخاب میں حافظ شیراز کے اس شعر پر عمل کرتے تھے ؎

کرنہیں لے جاتے، بلکہ کھلے بندوں اپنے بیگانوں سب میں۔ جن لڑکوں کو یہ اعزاز نصیب

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

یعنی اپنے اس مرشد روحانی کے ایما پر بی اے یا بی ایس سی یا انٹر آرٹس وغیرہ کے لئے مضامین کا چناؤ کرتے تھے۔ داخلے کے وقت عجیب عجیب لطیفے ہوتے تھے۔ علی گڑھ میں یونیورسٹی کے لق و دق علاقے میں ایک مقام منٹو سرکل کہلاتا ہے۔ اس کے بھی کئی حجرے تھے۔ منٹوڑی میں یونیورسٹی کا ہائی اسکول تھا۔ اس اسکول میں دور دراز سے آئے ہوئے طلبا بورڈر کی حیثیت سے ٹھہرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسکول ہر لحاظ سے شمالی ہند کے بہترین مراکز تعلیم ثانوی میں ایک تھا۔ اس اسکول نے برصغیر اور جنوبی افریقہ کے بعض بہت بڑے قائدین کو جنم دیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دوران قیام میں جنوبی افریقہ کے ڈاکٹر دادو جنہوں نے ایک زمانے میں ڈاکٹر ملان کی حکومت کے ظلم و ستم برداشت کئے تھے علی گڑھ تشریف لائے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کے عہد رفتہ کو آواز دی تھی، یعنی اس کمرے میں کچھ وقت گزارا تھا جہاں طالب علمی کے دور میں انہیں قیام کا موقع ملا تھا۔

غالباً ۱۹۰۳ء کے علی گڑھ میگزین میں میں نے مولانا شوکت علی کے قلم سے نکلا ہوا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں یونیورسٹی کے نو واردوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یونیورسٹی اسکول سے آنے والے طلبا کا بڑے شوخ انداز میں ذکر کیا تھا۔ اگر میری یادداشت میرا ساتھ دے رہی ہے، تو احسان حمید صاحب ابن سلطان حیدر جوش مرحوم سے جو ان دنوں اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ان علیگیوں سے جو اس اسکول میں پڑھ چکے تھے "معذرت کے ساتھ" مولانا شوکت علی نے ان طلبا کو حضرت کے چیلوں سے تعبیر کیا تھا۔ بعض صاحبان جو اوّل دن سے اس اسکول میں داخل ہو جاتے تھے ایم اے تک پہنچتے پہنچتے اپنی سنیارٹی کی عمر سولہ سال یا اس سے بھی زیادہ بتلانے

لگتے تھے اور اگر یہ حضرات چند سال فیل ہو جاتے تھے، تو پھر ان کا اندازِ کلام ہی اور ہوتا تھا۔

یونیورسٹی کو طلبا فراہم کرنے والا ایک اسکول اور بھی تھا، یہ سٹی اسکول کہلاتا تھا، مجھے اپنا سٹی اسکول جانا یاد نہیں رہا، ہو سکتا ہے کہ اس کی عمارت میں نے دیکھی ہو، لیکن یونیورسٹی کے ہنگامے اتنے زیادہ تھے کہ میں کم ہی شہر جاتا تھا۔ یہاں مجھے بے ساختہ جوش کا ایک بہت اچھا شعر یاد آگیا؎

اس فصل میں اس درجہ رہا ہے خود و سرشار
مے خانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

عجب اتفاق ہے کہ جب ۱۹۵۹ء میں میں مستقل قیام کی نیت سے کراچی آیا، تو کچھ دنوں کے لئے اپنے رند مشرب دوست قسیم فاضلی کے ہاں ٹھہرا، ان کے مکان سے ملا ہوا مکان زبیر صاحب کا تھا جو علی گڑھ سٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ زبیر صاحب نے بے شمار شاگرد چھوڑے ہیں، سنا ہے وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ جب میں قسیم کے یہاں قیام پذیر ہوا، تو زبیر صاحب جن کی بڑی بیٹی اب بیگم قسیم ہیں، فریش اور کافی علیل ہو چکے تھے اور کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

بات کہاں سے کہاں نکل آئی، میں ذکر ان لطیفوں کا کر رہا تھا جو داخلے کے وقت رونما ہو جایا کرتے تھے۔ ایک کلاسیکی لطیفہ جو تقریباً ہر سال دہرایا جاتا، وہ یہ تھا کہ گھاگ قسم کے سینیئر طلبا نو واردوں کو یہ پٹی پڑھاتے تھے کہ وہ منٹوڑی میں داخلے کے لئے اصرار کریں، ان سادہ لوح اور بے خبر لڑکوں کے فارم داخل میں "ہوسٹل جس میں داخلہ منظور ہے" کے خانے کے سامنے جلی حروف میں منٹوڑی لکھ دیا جاتا تھا۔ مت پوچھئے کہ پھر کیا کیا گل کھلتے تھے۔ طالب علم مسکین صورت بنائے منٹوڑی میں داخلے کی درخواست کر رہا ہے؟ اور جوں ہی طالب علم کی زبان سے نکلتا ہے جی میں نے سنا ہے کہ یہاں کا

ہمت یا سکتی تو اس مسکراہٹ ہی نے سلب کرلی۔ اس کے بعد موصوف نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا: "میں سمجھتا ہوں یہ لڑائی دو گہرے دوستوں میں ہوئی۔ اس لئے تم ہی دونوں کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آئندہ تمہارا باہم دگر کیا سلوک ہوگا! فی الحال میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ اچھا ایک روم میں چلے جاؤ اور جو کچھ فیصلہ کرو مجھے آکر بتاؤ!" پھر گردن کو ہلکی سی جنبش دے کر مسکرائے۔ اس سے فریقین کا رہا سہا دم خم بھی جاتا رہا۔ دونوں ایک روم میں گئے اور جلد ہی واپس آکر بتایا کہ جانبین نے صلح کرلی۔

ٹول صاحب نے فرمایا! "اچھا ہاتھ ملاؤ!" دونوں نے ہاتھ ملائے۔ ٹول صاحب پھر مسکرا دیئے اور فریقین بھاگ کھڑے ہوئے۔ تصفیئے کے تین نازک مرحلے ٹول صاحب نے صرف تین طرح سے مسکرا کر طے کر دیئے۔

یکی بارک کے ایک سینیر طالب علم میرے وطن سے آئے جہاں اُن کے والد گورنمنٹ کے ایک ذمہ دار عہدے پر مامور تھے۔ گھر والوں نے میرے لئے یونیفارم کا کپڑا بھیجا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے کمرے میں تشریف لائے۔ گھر والوں کی خیریت تفصیل سے سنائی اور بتایا کہ یونیفارم کا کپڑا لائے ہیں۔ میں نے بے اختیار پوچھا کہ کہاں ہے؟ مسکرائے اور بڑے اطمینان اور شفقت سے فرمایا: "کمرے میں ہے چار بجے شام کمرے پر آؤ میرے ساتھ چائے پیو، کپڑا بھی مل جائے گا!"

یہ توقف مجھے بڑا شاق ہوا۔ اس زمانے میں میرا یہ حال تھا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ساتھی یا شخص گھر والوں سے مل کر آیا ہے یا وہاں سے کچھ میرے لئے لایا ہے، تو طبیعت بے قابو ہو جاتی اور جب تک وہ آدمی یا خبر نہ مل جائے چین نہ آتا تھا۔ بارے وہ وقت آیا اور میں ان کے کمرے میں پہنچا۔ انہوں نے دروازے پر آکر پذیرائی کی دوسروں سے تعارف کرایا، کھیلنے اور پڑھنے کے بارے میں پوچھتے رہے بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا: "کپڑا مرحمت ہو میں جانا چاہتا ہوں۔!"

بولے: "ضرور ضرور!" نوکر کو آواز دی، آیا تو بکس کی کنجی اس کے حوالے کی اور کپڑا نکلوایا۔ میں نے چاہا کہ لے کر کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں، بولے: "ذرا ٹھہرو! نوکر چائے کے برتن ہٹادے تو وہ کپڑے صرف دو گز سرج اسے کر تمہارے ساتھ جائے گا۔"

میں چاروں خانے چت تھا، لیکن شاید چت ہونے میں ایک آدھ خانہ خالی تھا۔ اس لئے کہ جیب میں لئے کمرے پر پہنچا، تو وہاں ایک اور سینیر رونق افروز تھے۔ میں نے نوکر سے جھپٹ کر کپڑا لے لیا اور بکس کھول کر رکھنے لگا اور نوکر واپس جانے لگا تو سینیر صاحب نے مجھے مخاطب فرما کر باواز بلند فرمایا: "مولانا دو آنے نوکر کو میں دیئے دیتا ہوں آپ روپیہ بعد میں ترسائے رہیئے گا۔" اب میں بے شمار خانے چت تھا۔

ہسپتال میں بڑے ڈاکٹر صاحب سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتہ اُن کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شجاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو ہر بائے قافیہ یا علیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا۔ پستہ قد، کن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس، آواز مخدوش۔ ہاتھ میں رعشہ۔ نسخہ لکھتے تو انگشت شہادت اُچھلتی رہتی۔

اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لئے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر اُدھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اس طرح کی مہم میں ہم رکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: "قربان جایئے اس کمال پر ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور ناپ بھی کرتے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا کڑک کر بولے: "بدتمیز نکل جا ابھی ہسپتال سے!"

وہ صاحب فوراً چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ دوسروں نے پکڑ لیا اور ڈاکٹر صاحب سے زیادہ کڑک کر کہا: "یوں نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پر گر کر معافی مانگو ورنہ ہم سب تم کو یہیں مار ڈالیں گے!"

ہال کی جانب یورش کرتے تھے۔ یہاں سب کے سامنے ایک ہی قسم کا ناشتہ ہوتا تھا۔
مکھن اور علی گڑھ کے نہایت لذیذ خوش ذائقہ اور غذائیت سے بھرپور بسکٹ اور چائے۔
ہوسٹل کا ڈائننگ ہال بھی علم مجلسی کی ایک تربیت گاہ ہوتا تھا۔ مجلس اور مجمع میں آدمی کیسے بیٹھے
کیسے اُٹھے اور کس طرح ماکولات و مشروبات سے اپنے کام و دہن کو نوازے، یہ سب کچھ اور
بہت کچھ ہم یہاں سیکھتے تھے۔ سنیئر طلبا بھی ہم نو واردان پر خاص طور پر نظر رکھتے تھے۔

ہمارے یہاں آتے ہی ہمارے پلنگ جن پر مچھردانیاں لگی ہوتی تھیں۔ سلیقے سے
کمروں میں واپس بچھا دیے جاتے تھے۔ ہم لوگ جلدی جلدی تیار ہو کر اپنے اپنے کلاس روم
کا رُخ کرتے، ایک بات یاد نہیں رہی۔ جس سے ہمیں جوبلی گراونڈ زیر جہاں اب ہفت منزلہ
آزاد لائبریری بن گئی ہے ڈرل بھی کرنی پڑتی تھی۔

چند ہی دنوں بعد، اور یہ شاید اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا اور رمضانی جس میں اپنی دلنوازی
کی ابتدا کر چکی تھیں چند سنیئر طلبا میرے کمرے پر آئے اور ایسے لب و لہجے میں جس
میں تبسم کی گھلاوٹ بھی شامل تھی، مجھ ناچیز سے سرسید کی فاتحہ کے لئے چندہ طلب کیا۔
میں نے سنیئر طلبا کی بالادستی دیکھ لی تھی بغیر کسی لیت و لعل کے ایک رقم ان کی خدمت
میں پیش کر دی۔ معلوم ہوا کہ دوسرے طلبا نے بھی اپنے اپنے حصے کی رقمیں ادا کر دی
ہیں، مگر مزے کی بات یہ تھی کہ مرشد بزرگ کے لئے یہ چندہ صرف نو واردوں ہی سے
مانگا گیا تھا۔ دو تین دن میں نے بے صبری سے انتظار کیا کہ یہ فاتحہ کب ہوتی ہے اور
میں اس مقدس تقریب میں کب شریک ہوتا ہوں! معلوم ہوا کہ فاتحہ کی رسم بڑی [illegible]
کے ساتھ پہلے ہی انجام پا چکی ہے اور سرسید کے اصل نام لیوا یعنی ہوسٹل کے سنیئر طلبا
بڑے اطمینان سے جماعتی طور پر مرغ مسلّم وغیرہ نوش جان کر کے بانی مدرسۃ العلوم کی روح
پر فتوح کو ثواب پہنچا چکے ہیں۔

ادھر یہ سب کچھ ہوتا رہا، لیکن کلاسیں نہایت پابندی اور انضباط کے ساتھ ہوتی

رہیں۔ میرا داخلہ بی اے میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں احمد جمال یوسف، اقبال شفیع، احسان
رشید، اجلال حسین، عمر حیات خاں، فاروق فاطمی اور قمر الاسلام وغیرہ تھے۔ انگریزی
کا شعبہ انتہائی منظم اور فعال تھا۔ پروفیسر فلیڈلن انگریزی شعبے کے صدر تھے، خواجہ منظور حسین
مرتبے میں ان کے بعد تھے۔ غلام سرور صاحب، محمود حسین صاحب، مختار حامد علی صاحب
اور متعدد دوسرے جید علمائے انگریزی ادب ان کے علاوہ تھے۔ غلام سرور صاحب SHORT
STORY پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کا تابناک چہرہ اور سفید گھنگریالے بال اس وقت
میرے سامنے ہیں۔ وہ بظاہر سخت گیر تھے، مگر بہ باطن نہایت شفیق۔ ان کے پڑھانے
کا انداز یہ تھا کہ وہ خود کتاب میں گم ہو جاتے تھے اور پوری کلاس انہیں پورے سکون اور
احترام سے سنتی تھی۔ محمود حسین صاحب ہمیں ڈرامہ پڑھاتے تھے

برنارڈ شا اور یورپ کے دوسرے ڈرامہ نویسوں، ان کے ناقدین، شارحین اور انگریزی
ڈرامے پر یونانی تمثیل نگاروں کے اثرات کے بارے میں مجھے جو بھی معلومات حاصل ہیں
وہ سب محمود حسین صاحب ہی کا فیضان ہیں۔ وہ اپنی کرسی پر نہیں بلکہ میز پر آکر بیٹھ جاتے
تھے۔ اُن کے بیچ سے نکلی ہوئی مانگ، مسلسل طرز خطاب، بلا کی روانی، زبردست گویائی
اور کبھی کبھار چند فقرات آمیز سوالات کی بوچھاڑ، میری یادوں کا مستقل حصہ ہیں۔ پھر
مختار حامد علی صاحب تھے جو ہمیں انگریزی شاعری پڑھایا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو ملٹن،
شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ، کالرج سب سے تعارف اور وہ بھی بھرپور تعارف مختار
حامد علی صاحب ہی کی شیوہ بیانی کے طفیل حاصل ہوا۔ دبلے پتلے سے آدمی تھے۔ مختار
صاحب، مگر رعب داب اُن کا ایسا تھا کہ اُن کو دیکھتے ہی میرے شیاطین الانس
والجن دوست اپنی شیطنت بھول جاتے تھے۔ وہ آتے ہی اپنی گرجدار آواز، پائیدار
اور مسلسل آواز کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ کیا
بلحاظ لب و لہجہ اور کیا بلحاظ معلومات، مختار صاحب کا یہ لیکچر نگاہ میں وسعت اور نظر میں

گہرائی پیدا کر دیتا تھا۔

جناب بی اے خاں کو میں کیسے فراموش کر دوں جو شب و روز میں کم از کم تین بار لباس تبدیل کرتے تھے۔ آودی اودی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور بی اے خاں صاحب اسی مناسبت سے لباس زیبِ تن کئے ہوئے ہیں، انگریزوں سے بھی زیادہ انگریزیت لئے ہوئے ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار پروفیسر حبیب نے یو این او کے ایک اجلاس میں شرکت سے واپسی پر کہا تھا کہ انہوں نے بی اے خاں سے زیادہ فیشن ایبل یو این او میں بھی نہ دیکھا تھا۔ میتھیو آرنلڈ کی (CULTURE + ANARCHY) ایک تو یوں ہی نامانوس اور ادق تھی پھر خاں صاحب کے مشکل طرزِ ادا اور بہت زیادہ فرنگی طرزِ تکلم نے مجھے اس کتاب سے اور ڈرا دیا تھا۔

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

سلامت اللہ صاحب ہیں انگریزی انشا پڑھاتے تھے، مگر میں اُن کی تعلیم سے زیادہ مستفید نہ ہو سکا۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ وہ اساتذہ جو تعلیم سے فراغت کے فوراً ہی بعد اُستاد بنا دیئے جاتے تھے۔ وہ از سر نو لگ یا جونیئر ہو جاتے تھے اور انہیں کم از کم وہی درجہ حاصل ہو جاتا تھا جو ہم نوواردوں کو شروع شروع میں ملتا تھا۔ خوش لباسی اور طرحداری میں سلامت اللہ صاحب کا درجہ بی اے خاں صاحب کے بعد خاصا ممتاز تھا۔ اب کوئی کیا بتائے کہ یہ سب لوگ کہاں کہاں ہیں۔

"علی گڑھ میں نام رکھنے کا سلسلہ بہت پُرانا ہے۔ مولانا
حسرت موہانی کو اُن کی کلاس برادری "خالہ جان" کے
نام سے یاد کرتی تھی، آج کل بھی ایسے لوگوں کی
کمی نہیں "آپا جان" "پاندان" "باجی" اور "مسز
آفتاب عالم" اب بھی موجود ہیں۔ گزرے وقتوں میں
کوئی "نسیم کوا" تھے۔ دوسرے بزرگ "نسیم بلبل"
کے نام سے پکارے جاتے تھے،
اور ایک تیسرے
بزرگ کو
"جمیل گھوڑا" کہا کرتے تھے"

جناب نعمان احمد صدیقی

علی گڑھ تین چیزوں کے لئے مشہور ہے: تالے، بسکٹ اور مسلم یونیورسٹی۔ مسلم یونیورسٹی کی امتیازی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے۔ طالب علم اور استاد دونوں کی نقل و حرکت اور دلچسپیاں کلاس روم، ہوسٹل اور یونیورسٹی ایریا تک محدود رہتی ہیں۔ اس دنیا کو تنگ اور محدود سمجھا جاسکتا ہے اور بعض لوگ اسے خانقاہ یا مقبرے سے تشبیہ بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس تنگی میں وسعت کا احساس کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ انہیں شام و سحر کے اسی حلقے میں زندگی اپنے گوناگوں تنوع کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ علم اور بڑھاپے کا شعور، جوانی کا حوصلہ اور کھلنڈراپن، روحانی اور سیاسی جگ و دو، ذہنی جوہر، بھلے حسن و عشق کی گھاتیں اور ادائیں غرضیکہ زندگی کے سارے عوامل یونیورسٹی کے اس چھوٹے مگر حسین اور شفاف آئینے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بشرطِ نظر البتہ شرط ہے۔ پھر علی گڑھ کے طلبا لباس اور نشست و برخواست کا ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ کالی شیروانیاں، سفید پاجامے، کالے بُرقعے اور سفید غرارے۔ لباس کی ایک مخصوص روایت کا تاریخی ارتقا ہیں۔ سرِراہ اور کیفے دونوں جگہ سرگوشیوں میں بات کرنا یہاں کے آداب میں داخل ہے۔ کھُل کر باتیں بڑی مخصوص صحبتوں میں کی جاتی ہیں۔ علی گڑھ کی نمائش، کباب پراٹھا، یونین الیکشن اور بارے ہوؤں کے جنازے کی پٹائی یہ صرف علی گڑھ کیلئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی میں پچھتر فی صدی طلبا ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ اقامت گاہ اور درسگاہ ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ بازار، کھیل کود کا میدان، چائے خانے، سب ہی ایک دوسرے سے کہیں نہ کہیں بار بار ملتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان میں یہ احساس پیدا

ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کنبے اور برادری کے فرد ہیں۔ اجتماعی زندگی کا یہ عملی تجربہ علی گڑھ کے طالب علم کو اپنی مادرِ درسگاہ سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی اقامتی زندگی میں کھانے اور ناشتے نے کلاسکس کا درجہ حاصل کر لیا ہے، چائے، دو بڑے بسکٹ اور ایک ٹکیہ مکھن۔ علی گڑھ کے طالب علم یہ ناشتہ ایک صدی سے کرتے آئے ہیں۔ کھانے کی دو روٹی اور دو بوٹی بھی مشہور ہیں۔ سینیر طلبا کا کہنا ہے کہ چائے، بسکٹ اور مکھن کا ناشتہ اور کھانے میں دو روٹی اور دو بوٹی سرسید کا بتایا ہوا نسخہ ہے۔ اس میں کمی بیشی روایات کے خلاف ہے اور سرسید کے جانشین پابندی سے اس روایت پر عمل کر رہے ہیں۔

علی گڑھ کی اقامتی زندگی ریل پیل میں بسر کی جاتی ہے۔ اس ریل پیل میں آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ لڑکے رہتے ہیں۔ اُن کا آپس میں کوئی راز نہیں ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ کون بزرگ کن کن مشاغل میں دلچسپی رکھتے ہیں! وہ ایک دوسرے کی دلچسپیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ بھائی اپنا اپنا شوق ہے۔ کس کے پیسے کب آتے ہیں، اس کا علم سب کو ہوتا ہے اور اس علم کی بنا پر مہینے کی آخری تاریخوں میں قرض لینے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

یونین اور یونین الیکشن طلبا کی جملہ سرگرمیوں اور ہاؤ ہو کا مرکز ہوتے ہیں۔ یونین کے عہدیداروں کا انتخاب خاصی معرکہ آرائی کے بعد ہوتا ہے۔ یونین کا الیکشن لڑا نہیں لڑوایا جاتا ہے اور اس کے اصل ہیرو گھاگ اور سینیر قسم کے طالب علم ہوتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا مقصد یونین الیکشن لڑانا اور اس کا جیتنا ہارنا ہوتا ہے۔ دنیا میں اور بھی کچھ ہوتا ہے اُن کے کان پر جُوں نہ رینگے گی، لیکن جیسے ہی الیکشن قریب آیا اُن کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ اب وہ لینے اور پرکھانا پینا اور سونا حرام کرلیں گے اور ساری یونیورسٹی پر الیکشن کا بخار طاری کر کے دم لیں گے۔ الیکشن سینیر طالب علم کے لئے

اُس کی عزت و آبرو کا معاملہ ہوتا ہے۔ کنویسنگ دلچسپ اور معیاری پمفلٹ بازی کے ذریعہ ہموار کی جاتی ہے۔ در و دیوار پر رنگا رنگ پوسٹر اور کارٹون چسپاں کئے جاتے ہیں اور عین الیکشن کے دن حلق پھاڑ پھاڑ کر نعرہ بازی کے فن میں گراں قدر اضافے کئے جاتے ہیں۔ چند مثالیں سُنئیے :

کل کا بچہ ہائے ہائے (جو نیئر ہونے پر طنز)
گندا انڈا ہائے ہائے
آلو نِکلا ہائے ہائے
پاکٹ ایڈیشن ہائے ہائے

کئی سال ہوئے بُلبُلیا صاحب صدارت کے اُمیدوار تھے۔ اُن کے حمایتیوں کے پُرجوش نعرے یہ تھے :

صدر ہمارا بُلبُلیا
صدر ہوگا بُلبُلیا
لڑکا کہے بُلبُلیا
لڑکی کہے بُلبُلیا
تُو بھی کہے بُلبُلیا
میں بھی کہدوں بُلبُلیا
صدر ہمارا بُلبُلیا

نتائج کا اعلان ہونے کے بعد جنازہ پیٹنے کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ یوں تو مصنوعی جنازہ ساتھ لے کر ماتمی گھنٹہ بجاتے رہتے ہیں، لیکن اصل میں ہارنے والی پارٹی کے سینیئر طلبا کا فنکارانہ تعارف کرانا اس رسم کی جان ہے۔ اس سلسلے میں مرثیہ، ماتم اور ہزل کے دلچسپ اور نت نئے تجربے کئے جاتے ہیں۔ اکثر اشعار مخصوص حضرات

کی سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شعر خاصے دلچسپ ہوتے ہیں مثلاً ؎

جنہیں ٹماٹر دے کر جلایا گیا تھا
انہیں پھر جو مُرغا کھلاؤ تو جائیں

یونین کا اپنا ہال ہے جو کافی خوب صورت ہے۔ لیکن قد سے چھوٹا ہے۔ یہ ہال نوجوانوں کے عزم، خلوص، جوش و خروش اور حوصلہ مندی کا آئینہ دار ہے اور جہل جوانی، ناتجربہ کاری اور حماقت کا مرقع بھی۔ طلبا کی ذہنی کاوشیں، رومانی تگ و دو اور سیاسی ہڑ بونگ یہیں جنم لیتی ہیں۔

آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو نام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بھلا نام میں کیا رکھا ہے! جیسے نیم ناتھ ویسے نکاّن ناتھ، فرق کیا پڑا۔ لیکن علی گڑھ کی دنیا میں ناموں کے انتخاب میں کافی کاوش و کوشش سے کام لیا جاتا ہے۔ ترکی، عربی اور فارسی کے خوبصورت ناموں سے مکانوں کے وقار اور دلکشی میں اضافہ کرنا اُن کے شستہ مذاق کا ثبوت ہے۔ "الحمرا" آپ کو اسپین کے خوب صورت طرزِ تعمیر کی یاد دلائے گا۔ "کوشک" آپ کے ذہن کو ترکی کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں لے جائے گا۔ شراب و شعر کی سرزمین ایران کی یاد دلانے والے نام بھی ملیں گے "شبستان" "سفینہ" "نشیمن"۔ "گُلِ رعنا" "گوشہ" یہ صرف مکانوں کے حسین نام ہی نہیں، ایک شاندار تہذیب اور عظیم تمدن کے مظہر بھی ہیں۔ ناموں کے نئے تجربے بھی گناہ نہیں سمجھے جاتے۔ چائے خانوں کے نام بڑے دلچسپ ہیں: "کیفے ڈی پیرس"۔ "کیفے ڈی الف لیلے"۔ "کیفے ڈی جمیل"۔ دروازوں اور پھاٹکوں کے نام: "باب حق"۔ "باب العلم" اور "باب الرحمت" ہیں۔

یہاں کی سڑکیں حالی، شبلی، ذکاءاللہ اور نذیر احمد کی یاد دلاتی ہیں۔ ناموں کا ایک سلسلہ اور بھی دلچسپ ہے۔ یونیورسٹی برادری بعض طالب علموں کو مخصوص ناموں سے یاد کرتی ہے۔ یہ نام شہرت عام نصیب ہونے کی سند ہوتے ہیں۔ یہ نام چھپ چھپ

ہوتا ہے، وہ اس سے خفا نہیں ہوتے، بلکہ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں۔ طنز کو
اس فراخ دلی سے قبول کر لینا بڑے ظرف اور خوش مزاجی کی بات ہے۔

علی گڑھ میں ناموں کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ مولانا حسرت موہانی کو اُن کی کلاس
برادری خالہ جان کے نام سے یاد کرتی تھی۔ آج کل بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ آپا جان،
پاندان، باجی اور مسز آفتاب ہال اب بھی موجود ہیں۔ گزرے وقتوں میں کوئی "نسیم کوّا"
تھے دوسرے بزرگ "نسیم کھجلی" کے نام سے پکارے جاتے تھے اور ایک تیسرے بزرگ
کو "جمیل گھوڑا" کہا کرتے تھے۔ "نصیب چچا"، "نفیس اوچھا"، "خلیق انڈا" اور "استاد
چھوارا" تو ایسے نام ہیں کہ انہوں نے اصل ناموں پر بڑے اطمینان سے قبضۂ مخالفانہ
کر رکھا ہے۔ "ہیرا تنّاکا" اور "جنرل نجیب" بھی خاصے دلکش اور پُروقار نام ہیں۔

● زبیری کا معمول تھا کہ صبح لوٹا ہاتھ میں لیے جب وہ
بیت الخلا جاتے تو ایک کمرے کو ضرور جھانکتے اور اُس
کے پٹ کھول کر خاص انداز میں بڑے لہک کر کہتے ؎

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

ادھر دھیمی آواز میں یہ کہتے ہوئے گزر جاتے ؎

ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

چودھری محمد محمود علی خاں

میں ۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے انٹر کالج میں داخل ہوا۔ کالج کے پرنسپل اُس وقت جناب عبدالمجید قریشی تھے۔ یہ اُن کی آن بان کا زمانہ تھا۔ بڑا رعب داب تھا۔ نوکیلی تیز بڑی بڑی مونچھیں، ستواں ناک، بلند پیشانی، وہ ترکی ٹوپی اور سوٹ میں جب نکلتے، تو لڑکوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ کالج کے وقار کو جو چار چاند انہوں نے لگائے باید وشاید۔ وہ شان و عظمت کسی کالج کی دیکھی نہ تھی۔ میں نے وہاں ڈبیٹ اور ڈراموں میں بڑے ٹھاٹ سے حصہ لیا اور طلائی تمغے حاصل کیے۔ برنارڈ شا کے ڈرامے ایپل کارٹ "میں کوئین کے پارٹ کی ادائیگی میں نے کی۔ یہ ڈرامہ میرس ہاسٹل کے ہال میں اتنے شاندار انداز میں ہوا کہ گورنر یوپی کے ملٹری سیکرٹری جو یہی ڈرامہ اپنے ہم وطنوں کا پیش کردہ ولایت میں دیکھ کر آئے تھے، یہاں دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اس کا اعتراف انہوں نے بڑے اونچے الفاظ میں تقسیم انعامات کے موقعے پر کیا۔ کنگ کا پارٹ میرے ہم جماعت حیدر آباد دکن کے مرزا حیات بیگ نے ادا کیا اور حق ادا کر دیا۔ انہوں نے اس موقع پر ڈاڑھی رکھی تھی جو اُن کے چہرے پر بڑی بھلی لگتی تھی۔

میرا تعلق علی گڑھ کے ایک ممتاز راجپوت خاندان سے ہے۔ علی گڑھ اور مظفر نگر میں خاص کر مسلمان راجپوت اور پٹھان رئیسوں کی حکومت تھی اور ایسی حکومت اس دورِ انحطاط میں واقعی دیدنی تھی۔ گھر پر مجاز لکھنوی آتے، پہروں بیٹھتے، چائے پیتے اور لہک لہک کر اپنا کلام سناتے۔ اُن کی نظمیں رات اور ریل، "گرلز کالج کی لاری" اور "نمائش کی شام" کے مناظر سنیما سلائیڈ کی طرح آنکھوں میں گھوم رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی شامیں کتنی راتیں اور کتنی حسین ساعتیں اُن کے ساتھ اُن کے مکان کے سامنے گرلز کالج کے طواف میں گزری

ہیں آہ! ع

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں

اُن کی مشہور نظم: ؎

وہ نوخیز نورا اور وہ بنتِ مریم
وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پُر خم

آنکھوں دیکھی کہانی ہے۔ علاوہ ازیں: ؎

مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی
شرارت بھی بے وقت کیا ایسی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چرا لی

کیا ان تشبیہات کا جواب ہو سکتا ہے؟ مجاز، جاں نثار اختر، پرواز مراد آبادی۔ مہدی، وہاب انصاری، اصغر اور کیسے کیسے ماہ پارے اُس زمانے کے ساتھی تھے۔ کیسی کیسی رنگ رلیاں رہتی تھیں۔ کوئی تفریق یا دوئی کا سوال نہ تھا، بلکہ یہ الفاظ علی گڑھ کی ڈکشنری سے باہر تھے۔ کسی کا منی آرڈر آتا کوئی وصول کر لیتا، نہ کپڑوں کا ہوش تھا، نہ تن بدن کا بس ایک جوش تھا کہ "محوِ تماشائے جوش تھا" کے مصداق شب و روز گزرتے تھے۔

کالج میں نذیر اور لونی ایسے ملے کہ جیون ساتھی ہو گئے۔ کبھی اور شہنشاہ کا جوڑ بھی خوب تھا۔ ایک روز مولانا احسن مارہروی کلاس لے رہے تھے، کبھی کو نہ جانے کیا سوجھی کہنے لگے: "بچپن میں مولانا نے بڑا گھاس کیا ہو گا!" مولانا نے سن کر اپنی تیز تیز رکتی ہوئی زبان میں فرمایا: "جی ہاں آپ اپنے باپ کو بھی ایسا ہی کہتے ہوں گے، ذرا آپ کی شکل تو دیکھئے!" اور کبھی واقعی ع

"آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے" کا مصداق بن گئے

ایسا ہی ایک دفعہ مولانا حاضری لیتے لیتے بولے: "صدیق! یہ ٹوٹی کیا ہے؟" تجلی جھٹ بول اُٹھے: "طاعونی"۔ مولانا! بچپن میں انہیں طاعون ہو گیا تھا، تو طاعونی کہلانے لگے۔" اور کلاس کشتِ زعفران بن گئی۔

احسان حیدر، الطاف قریشی اور ریاض خان، جو ہمارے پیارے دوست تھے، نذیر بڑے ذہین اور طباع تھے۔ ممتاز ہوسٹل میں بڑے ٹھاٹھ کی سنیئر فوڈ مانیٹری کی۔ سامنے مولانا سلیمان اشرف کی قیام گاہ تھی۔ اُن کا مرغ کبھی غلطی سے سڑک کے پار بانگ دیتا آنکلتا، تو بیچارہ پار ہی ہو جاتا۔ ہوسٹل میں کھانا تو خوب تھا ہی، سنیئر فوڈ مانیٹر کا طعام خانہ مرغ پلاؤ سے کبھی خالی نہ رہا۔ عباسی اور زبیری ہوسٹل کے خاص کیریکٹر تھے۔ زبیری کا معمول تھا کہ صبح لوٹا ہاتھ میں لئے جب وہ بیت الخلاء جاتے، تو ایک ایک کمرے کو ٹھوکر لگاتے اور اُس کے پٹ کھول کر خاص انداز میں بڑے لہک کر گاتے۔ ؎

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

اور پھر دھیمی آواز میں یہ کہتے ہوئے گزر جاتے ؎

ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

انہیں آشوبِ چشم کا عارضہ تھا، جانے کیا بات تھی آنکھیں چھپائی رہتیں، سرخ ہو جاتیں اور پانی نکلتا رہتا۔ لوگ پوچھتے: "زبیری صاحب یہ کیا ہو گیا؟" فوراً اپنے خاص انداز میں جواب دیتے: "جی کچھ نہیں، ذرا آنکھوں کا گھنٹو یا ہو گیا ہے۔"

عباسی حلق سے بولتے اور سیاست میں دخل دیتے۔ لوگوں سے پنجیں لڑاتے رہتے۔ شاید بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، وہیں رہ گئے۔ ضیاء الدین مرحوم کو شیخ نذیر کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ضیاء الدین کے کالج میں داخلے کا واقعہ بھی عجیب تھا، کہنے لگے: "ہم سندھی لوگ کچھ اجڈ سے تھے۔ گاؤں سے سیدھے آکر کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں یونیفارم کا چکر تھا۔ شہر گئے اور ٹرکش کوٹ سلوایا، پہنتے ہی پھٹ گیا۔ ہم واپس پرنسپل ڈاکٹر

ولی محمد صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے مقدمہ سُن کر فرمایا: "اتنے لمبے چوڑے نوجوان ہو، دیکھ کر لیا ہوتا۔" بولے: "جناب ہمارے والد صاحب کے ذمے یہ کام تھا، علی گڑھ انہوں نے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ وہاں کے استاد تمہیں والد سے زیادہ شفیق ملیں گے، ہم نے کپڑا و بڑا کاٹ کے کہیں سے خریدا تھا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ یہ فرمائیں گے، تو علی گڑھ کبھی نہ آتے۔"

یہ سُنتا تھا کہ ولی محمد صاحب خاموش ہو گئے پھر فرمایا: "اچھا کوٹ چھوڑ جاؤ" تیسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کپڑے والا کمرے کے سامنے کھڑا ہے اور کوٹ کی پوری قیمت مع سلائی دے رہا ہے۔ ضیاء الدین کو یہ واقعہ عمر بھر نہیں بھولا۔

ولی محمد صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے مقدمہ سُن کر فرمایا: "اتنے بلے چوڑے نوجوان ہو، دیکھ کر لیا ہوتا۔" بولے: "جناب ہمارے والد صاحب کے وقتے یہ کام تھا علی گڑھ انہوں نے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ وہاں کے استاد تمہیں والد سے زیادہ شفیق ملیں گے، ہم نے کپڑا وغیرہ کا ہے کو کبھی خریدا تھا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ یہ فرمائیں گے، تو علی گڑھ کبھی نہ آتے۔"

یہ سُننا تھا کہ ولی محمد صاحب خاموش ہو گئے پھر فرمایا: "اچھا کوٹ چھوڑ جاؤ۔" تیسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کپڑے والا کمرے کے سامنے کھڑا ہے اور کوٹ کی پوری قیمت مع سلائی دے رہا ہے۔ ضیاء الدین کو یہ واقعہ عمر بھر نہیں بھولا۔

پیشکش :۔ محمد احمد ترازی

آپ اس میں سے جتنا بھی لے لیں، کم ہے۔

ارشادِ رسولؐ ہے: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" ــــ اور یہ فرض زندگی بھر عاید رہتا ہے۔

"مکتبۂ اردو ڈائجسٹ" آپ تک علم پہنچانے کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہ ادارہ مختلف موضوعات پر خوبصورت اور مفید کتابیں قارئین کی خدمت میں معقول قیمت پر پیش کرتا ہے۔

یہ کتابیں واقعی پڑھنے کے لائق ہوتی ہیں اور آپ کے ذوقِ مطالعہ کی صحیح تسکین کرتی ہیں۔

مکتبہ اردو ڈائجسٹ کی خوبصورت، دیدہ زیب اور جاذبِ نظر مطبوعات آپ کی ذاتی لائبریری کے لیے باعثِ زینت اور علم کا مستقل سرچشمہ ہوں گی۔

ان سنجیدہ، ہلکے پھلکے اور علمی موضوعات پر مبنی کتابوں سے آپ کے مطالعے کو وسعت ملے گی اور آپ کی علمی تشنگی دور ہو جائے گی۔